خالد جاوید

تین کہانیاں

IInd Edition

خالد جاوید

پیدائش : 9/مارچ 1963 (بریلی، اُتر پردیش)

تعلیم : ایم۔اے۔، فلسفہ، سیاسیات اور اُردو ادب
ایم۔بی۔اے۔، مارکیٹنگ مینجمنٹ

معاش : روہیل کھنڈ یونیورسٹی میں پانچ سال
تک فلسفہ کے لیکچرر رہے۔ ایک سال تک
دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ ایسوسی ایٹ
رہنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے۔ جہاں وہ
فی الحال پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

کتابیں : برے موسم میں، آخری دعوت اور
تفریح کی ایک دوپہر (کہانیوں کے مجموعے)
مَوت کی کتاب اور نعمت خانہ (ناول)
گابریل گارسیا مارکیز اور میلان کنڈیرا (تنقید)
کہانی مَوت اور آخری بدیسی زبان (ادبی مضامین)
فلسفہ وجودیت اور ادبی تنقید

جاری...

تین کہانیاں

خالد جاوید

تین کہانیاں

خالد جاوید

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

نام کتاب : تین کہانیاں
ناول نگار : خالد جاوید
مطبع : گلوری لیس پرنٹرس، دہلی
سرورق : ٹیم عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Teen Kahaniyan (Fiction)
by **Khalid Jawed**
IInd Edition: 2020 ₹ 200/-

تین کہانیاں کے تمام کردار، مقامات اور واقعات فرضی ہیں، جن سے کسی بھی قسم کی مطابقت محض ایک اتفاقی امر ہو سکتا ہے۔ مصنف اور پبلشر اس مطابقت کے لیے ذمہ دار نہیں ہیں۔

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6	011-23260668
کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی	011-23276526
راعی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد	+91 7905454042
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	+91 9358251117
بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4	+91 9304888739
کتاب دار، ممبئی	+91 9869321477
ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد	+91 9246271637
مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد	+91 9325203227
عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ	+91 9433050634

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +91 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

آصف فرخی

کے نام

فہرست
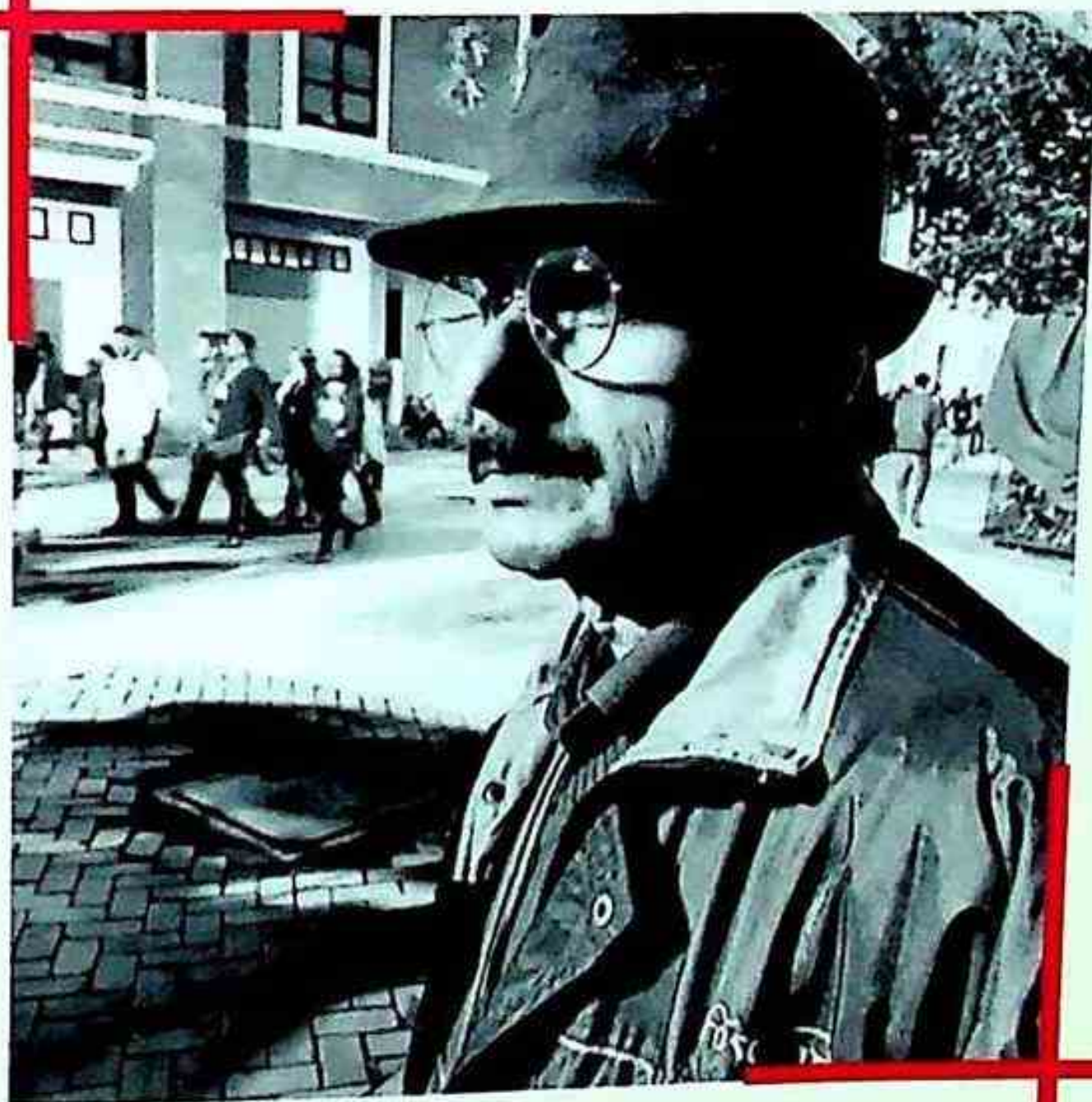
پیش لفظ

کھانیوں کا پھلا مجموعه ''بُرے موسم میں' سنه 2000 میں شائع ھوا تھا۔ دوسرا مجموعه 'آخری دعوت' کے نام سے پینگوین پبلشرز نے 2007 میں چھاپا اور تیسرا 2008 میں 'تفریح کی ایک دوپھر' شھزاد پبلی کیشنز، کراچی سے شائع ھوا۔ کھانیوں کے ان تین مجموعوں کے بعد، اب یه چوتھا مجموعه ھے جس میں صرف تین کھانیاں شامل ھیں۔ یه کھانیاں رسائل میں تو شائع ھوئی تھیں مگر میرے کسی پرانے مجموعے میں شامل نھیں تھیں۔ یوں دیکھیں تو تیسرے اور چوتھے مجموعے کے درمیان تقریباً باره سال کا طویل عرصه ھے۔

ھمیشه کی طرح، میں ان کھانیوں کے بارے میں بھی کچھ کھنے سے قاصر ھوں۔ سوائے اس کے که یه کھانیاں اس خوبصورت دنیا کی ایک غلط تشریح ھیں لیکن اگر میں اس غلط تشریح کو یھاں بیان کرنے بیٹھ جاؤں تو وه تشریح نه ره کر، دوباره 'تین کھانیاں' کھلائے گی۔ کیونکه بقول ھیرالڈ بلوم ھر تفھیم، تشریح اور ھر تنقید اپنے آپ میں ایک نئی کھانی ھوتی ھے۔ اس کا تعلق اُس فن پارے سے بھت دور کے رشته دار جیسا ھوتا ھے جس کی تشریح کی جاتی ھے۔

مگر اتنا میں پھر بھی کھنا چاھتا ھوں که یه کھانیاں دراصل میری ھی پرانی کھانیوں کی راکھ سے پیدا ھوئی ھیں جس طرح فینکس (Phoenix) نام کے دیومالائی

پرندے کی جب موت کا وقت آتا ھے تو اُس کے جسم میں آگ لگ جاتی ھے اور اسی آگ میں بھسم ھو جانے کے بعد وہ راکھ سے دوبارہ پیدا ھو جاتا ھے۔ اِسی طرح یہ تین کھانیاں بھی میری پرانی کھانیوں کے کرداروں کی جلی ھوئی پرچھائیوں سے پیدا ھوئی ھیں۔

جے کرشنا مورتی نے ایک جگہ لکھا ھے:

"So there is only one thing, and is to discover that all that I have done is useless ashes! You that does not depress one. That is the beauty of it. I think it is like Phoenix.
Rising from the ashes.
Born of ashes."

ھمیشہ کی طرح ایک بار پھر میں یہ آگاہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ کھانیاں پڑھنے والے کو خوش کرنے کے لیے نہیں لکھی گئی ھیں اور نہ ھی اُس کے خود ساختہ مفروضوں کو مطمئن کرنے کے لیے۔

رھا سوال انھیں 'کتاب' کی شکل میں شائع کرانے کا، تو اُس کی وجہ کچھ تو میری بچکانہ خواھش ھے اور کچھ اس لیے بھی کہ اس ناقابلِ برداشت حد تک 'خوبصورت دنیا' میں اب نہ صرف میرے بلکہ شاید ھر ایک کے دوستوں کی تعداد بہت تیزی کے ساتھ گھٹتی جا رھی ھے۔

خالد جاوید

یکم دسمبر 2019، دھلی

I Meant I am not to be understood even by myself. And I can't tell you why, but I believe my happiness depends on my not understanding.

John Fowls

He who interrogates me also knows how to read me.

Jacques Lacan

تاش کے پتوں کا عجائب گھر

(برگمین کی فلم سیونتھ سیل سے متاثر ہو کر)

''خدا نہ صرف یہ کہ دنیا کے ساتھ جوا کھیلتا ہے بلکہ کبھی کبھی اس کے پانسے انجان مقامات پر بھی گر جاتے ہیں۔''

—اسٹیفن ہاکنگ

کمرے کے دروازے کو بغیر کھولے ہی ببول کے درخت جیسا وہ سایہ خاموشی سے اندر آ گیا۔ سامنے بستر پر بالکل سفید کپڑے پہنے وہ لیٹا تھا۔ خاموش آنکھیں بند کیے ہوئے مگر کچھ اس طرح کہ اگر وہ آنکھیں کھلتیں تو سب سے پہلے انھیں چھت ہی نظر آتی۔ چھت جس کی بے داغ سفیدی میں باہر پھیلی ہوئی مردہ چاندنی کی ٹھٹھرن بھی شامل تھی۔ سائے کے اندر داخل ہوتے ہی کمرے میں اچانک سردی بڑھ گئی۔ پھر وہ بڑھتی ہی گئی۔ کھڑکی کے ہلتے ہوئے پردوں میں، بستر کی چادر اور میز کے نیچے رکھے خالی جوتوں اور موزوں میں۔

ببول کے درخت جیسے سائے نے اپنے آپ کو سکیڑا اور کمرے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا مگر اس کے باوجود کرسی کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ سامنے دیوار پر مدھم روشنی والا ایک

بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں کھونٹی پر ٹنگی ہوئی ایک قمیص کی پرچھائیں کانپ رہی تھی۔ مگر ببول کے درخت کے سائے کا سایہ کمرے میں کہیں پر نہیں پڑ رہا تھا۔ پلنگ کے نیچے ایک چوہیا نے کھڑ بڑ کی پھر نہ جانے کیوں خوف زدہ ہو کر کہیں دبک گئی۔

ادھر کچھ عرصے سے وہ لگاتار اپنے احباب اور عزیزوں کو مرتے ہوئے دیکھ رہا تھا اس لیے موت کے تئیں اس کا تجسس کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ آخر کار آج دن میں اس نے تہیہ کر ہی لیا۔ اس نے اپنے پوتے کی سبز رنگ کی لکڑی کی گیند کو صاف کر کے کونے میں احتیاط کے ساتھ رکھ دیا۔ وہ غسل بھی کرنا چاہتا تھا۔ دن بھر بے حد سرد ہوائیں چلتی رہیں۔ آخر کار ان ہواؤں کے رکنے کا انتظار کرتے ہوئے، رات کے گیارہ بجے وہ بے حد اطمینان کے ساتھ ٹھنڈے پانی سے نہایا۔ زندگی میں پہلی بار نہاتے وقت اس نے طہارت کے تمام اصولوں کو سختی کے ساتھ برتا۔ غسل کرنے کے بعد اس نے مدتوں سے لوہے کے کالے بکس میں رکھے سفید براق کرتے پاجامے کو پہنا۔ وہ اپنی آنتوں میں بھاری پن اور آلودگی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا اس لیے صرف ایک کھجور کھا کر اور ایک کٹورہ پانی پی کر وہ صاف ستھرے بستر پر آکر چت لیٹ گیا۔ اس نے اپنے سینے تک سفید غلاف والا لحاف اوڑھ لیا اور سفید چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ پاک صاف مرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے موت کو آواز دی۔ اسے بہر حال یقین اور یہ اطمینان تھا کہ وہ خود کشی کا مرتکب نہیں ہو رہا ہے کیونکہ وہ اپنے جسم کو نہ صرف یہ کہ ہلاک نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے معمولی سے معمولی بھی گزند نہیں پہنچا رہا تھا۔ اس کے برخلاف وہ تو اپنے جسم کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی روح کو خود ہی جسم سے باہر نہیں نکال رہا تھا جس طرح کمرے میں گھس آئی کسی آوارہ بلی کو، ہش ہش کر کے اور فرش یا دیوار پر ڈنڈا مار مار کر بھگایا جاتا ہے اور ڈنڈے کی چوٹ سے فرش یا دیوار زخمی ہوتی رہتی

ہے۔وہ اپنی جان لینے کی تمام تر ذمہ داری موت کے سر پر ہی ڈال دینا چاہتا تھا۔
وہ جانتا تھا کہ موت معین ہو کر بھی اس معنی میں غیر معین ہے کہ وہ کبھی بھی آسکتی ہے جس طرح تاش کی کوئی بازی کبھی بھی ہاری یا جیتی جا سکتی ہے۔اس لیے وہ بھی ایک بازی کھیل رہا تھا کہ آخر جب اس کے اتنے احباب اور ملنے والے ایک کے بعد ایک کر کے مرتے جارہے ہیں تو وہ کیوں نہیں مر سکتا۔لہذا بے خبری میں مارے جانے سے بہتر ہے کہ ہوشمندی اور اپنی مرضی اور خواہش کے ساتھ قاعدے کے حالات میں مرلیا جائے۔یہی وجہ تھی کہ موت میں اس کی دلچسپی بڑھتی ہی جارہی تھی اور زیادہ انتظار کرنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ویسے بھی دوسروں کی موت سے وہ تقریباً مردہ ہو چکا تھا۔اس کا اپنے آپ سے پہلا رشتہ تو ایک ماتم میں ڈوب جانے بھر ہی رہ گیا تھا۔اسے لگتا تھا جیسے اس کی روح میں جھاڑو سی پھر گئی ہو۔وہاں، یعنی روح میں کچھ نہیں بچا تھا۔

اب نہا دھو کر اور پاک صاف سفید کپڑے پہن کر وہ موت کا اس طرح خیر مقدم کرنا چاہتا تھا جس طرح گھر میں پہلی بار آنے والے کسی منفرد اور بے حد معزز مہمان کا کیا جاتا ہے۔اس نے چھت کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی آسمان کی نیلگوں بیکرانی کو دیکھتا ہے۔اسے توقع تھی کہ موت وہیں سے آہستہ آہستہ اتر کر اس کے پاس آئے گی جس طرح کبھی کبھی آہستہ آہستہ وہاں سے بارش کی بوندیں گرتی ہیں۔اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

مگر وہ نیلگوں آسمان کی بیکرانی سے اتر کر نہیں آئی۔وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی سردی بڑھنے لگی۔

سردی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔اس نے سردی کو اپنے سفید لحاف میں اور سفید کرتے پاجامے میں بھرتے ہوئے محسوس کیا۔اس کی ہڈیاں دکھنے لگی۔اتنی سی دیر سونے سے

بھی نہ جانے کیوں آج اس کی آنکھوں میں کیچڑ بھر گئی تھی۔ کیچڑ بھری آنکھوں سے دنیا کو دیکھنا دراصل ایک نئی روشنی میں دنیا کو دیکھنا تھا۔ اس کی نظر سامنے پڑی کرسی پر پڑی جس پر وہ ببول کے درخت جیسا سایہ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

''تو تم آگئیں'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں'' سائے نے جواب دیا مگر اس کی آواز آواز نہ ہوکر صرف اس کی پرچھائیں تھی۔

''میں نے تمہیں پکارا تھا۔ چھت سے پرے، آسمان کی طرف دیکھ کر، تم نے سن لیا تھا؟''

''ہاں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کوئی دعا، بددعا، کوئی نفرت یا محبت اور خواہش بھی اسی طرح خلاؤں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ اسے کوئی بھی سن سکتا ہے۔ میں تو موت ہوں۔ درخت بگولے، کائی اور ڈھلتی ہوئی شامیں تک انھیں سن لیتی ہیں۔''

''تو کیا مجھے اب تھوڑا سا وقت بھی نہیں مل سکتا؟'' وہ کچھ ہراساں ہوا۔

''وقت۔ کیسا وقت؟''

''زندہ رہنے کا۔''

''میں تمھاری موت نہیں ہوں۔ میں صرف موت ہوں۔ ابھی تو مجھے یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ میں کس کی موت ہوں۔ مگر اتنا تو یقینی ہے کہ میں تمھاری موت نہیں ہوں۔ اپنی موت کو کوئی آواز نہیں دیتا۔ تم نے کسی دوسرے کی موت کو پکارا تھا۔'' سائے نے افسردگی سے کہا۔

''مجھے سردی بہت لگ رہی ہے۔''

''ہاں۔ میری وجہ سے۔ کیونکہ میں زندگی کی حرارت سے خالی ہوں۔ لاؤ میں اس سردی کو تھوڑا سا کم کردوں۔'' سائے نے جواب دیا پھر اچانک اپنا حجم کم کرلیا۔ وہ سکڑتا چلا گیا۔ اب وہ کرسی پر بیٹھا اس طرح نظر آیا جیسے گملے میں سوکھی جھاڑی۔

کمرے میں سردی کم ہونے لگی۔

اس نے اطمینان کی سانس لی پھر بولا۔

''اس بات کا کیا مطلب ہے کہ تم میری موت نہیں ہو۔''

''کیونکہ ہر شخص کی اپنی ایک انفرادی موت ہوتی ہے۔اس کے وجود کے اندھیرے کی طرح، اس کے محبوب کی طرح، اس کی اولاد کی طرح اور اس کی زندگی کی طرح۔''

''میں شاید نہیں سمجھ پا رہا ہوں'' وہ بے بسی کے ساتھ بولا اور اپنے سفید کرتے پاجامے کی طرف دیکھنے لگا جو نہ جانے کیوں اب ملگجا ملگجا سا نظر آنے لگا تھا۔

''چلو میں ذرا تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں اگرچہ میں زندہ انسانوں کے ترسیل و ابلاغ کے مسائل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مگر یوں سمجھ لو بلکہ یقین کرو کہ اس سے پہلے تمہیں کسی نے شاید یہ نہیں بتایا ہوگا...... نہ تمہاری سائنس نے، نہ فلسفے نے اور نہ کسی مذہب نے کہ موت بھی دراصل، زندگی کی ہی طرح ایک نہیں ہے۔جس طرح زندگی اپنی نشوونما کرتی ہے اسی طرح موت کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔جس طرح زندگی فنا ہو جاتی ہے اسی طرح موت کے مقدر میں بھی فنا ہونا لکھا ہے۔جس طرح زندگی کو ایک جسم چاہئے اسی طرح موت کو بھی ایک خالی جسم درکار ہے۔چاہے وہ انسانوں کے ذریعہ خالی کیا گیا جسم ہو یا جانوروں اور کیڑوں مکڑوں کے ذریعے۔ ہر نئی زندگی کی طرح ایک نئی موت بھی ہوتی ہے۔اگرچہ زندگی اور موت ایک دوسرے کے دشمن نظر آتے ہیں مگر دراصل یہ صرف اپنا اپنا دھرم نبھائے جا رہے ہیں۔اور موت تو منافقت سے یکسر خالی اور پاک ہے۔مگر زندگی منافق ہے۔زندگی کا بال بال اس اندھیرے مادے کے قرض میں ڈوبا ہوا ہے جس سے وہ پیدا ہوتی ہے۔ اندھیرا شعور نہیں ہے۔اندھیرا مادہ ہے مگر احسان فراموش زندگی وہ کمینی اور گھٹیا روشنی ہے جو

اندھیرے کے بدن پر سانپ کی طرح چلتی ہے۔ اندھیرے کی جنمی اندھیرے کو ہی مٹا دینا چاہتی ہے۔ مگر تم خفامت ہو۔ تم صرف زندہ انسان ہو۔ زندہ انسان میرے سامنے بستر پر لحاف میں دبکا ہوا، کائنات کا سب سے بڑا بے چارہ اور ازلی احمق۔ بے چارہ محض ایک زندہ انسان جو اپنے جسم میں زہر کی طرح پھیلنے والے شعور کی مکاریوں اور بلاک خیزیوں سے واقف ہی نہیں۔"

سایہ ایک لمبی تقریر کرنے کے بعد شاید طنزیہ انداز میں مسکرایا بھی تھا کیونکہ سوکھی جھاڑی کا اوپری سرا عجیب انداز میں ہلنے لگا تھا۔

اسے غصہ تو آیا مگر تب ہی اس نے محسوس کیا جیسے باہر ہوا تیز تیز چلنے لگی ہے۔

"شاید باہر ہوا تیز ہوگئی ہے" اس نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

"ہواؤں کے بارے میں سوچنا بے کار ہے۔ وہ یوں ہی چلتی رہتی ہیں۔ ان کے مزاج میں آوارگی، شیطنیت اور فحاشی بھری ہوتی ہیں مگر میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ ان سے زیادہ حقیر اور بچکانہ اشیا کائنات میں دوسری نہیں ہیں۔"

"ہاں تم...... تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

میں تمھارے گوش گزار کر رہی ہوں کہ زندہ انسان، زندگی نہیں ہے۔ زندگی کو صرف موت ہی دیکھ اور سن سکتی ہے۔ زندہ انسان تو زندگی کے پراسرار گلیشیئر کی اوپری برف سے تعمیر شدہ محض ایک جزو بھر ہے۔ اصل زندگی تو موت سے بھی زیادہ پراسرار ہے بلکہ موت تو بے چاری اپنی ماہیت میں قطعی پراسرار نہیں ہے مگر افسوس کہ اس مایوس کن حقیقت کو بھی صرف ایک موت ہی جانتی ہے۔"

کرسی پر بیٹھی پرچھائیں اچانک اداس نظر آنے لگی۔ اس پرچھائیں کا کوئی چہرہ نہیں تھا

مگر یہیں اسے اس امر کا عرفان ہوا کہ افسردہ نظر آنے کے لیے کوئی انسانی چہرہ یا کوئی جسم ہی لازمی نہیں ہوتا۔

''تم کچھ اداس ہوگئی ہو'' اس نے لحاف کے اندر سے اپنا ایک پیر باہر نکال لیا جو ٹھنڈے کے باعث بے حد سوجا ہوا تھا۔

''پیر اندر کرلو۔ ہاں۔ نہیں۔ میں کیا کہہ رہی تھی؟ دراصل یہ بہت افسوسناک ہے کہ ہر موت کا حافظہ بہت خراب ہوتا ہے۔''

اس بار وہ اپنے غصے کو دبا نہیں سکا۔ اپنا پیر لحاف کے اندر کرتا ہوا وہ پھٹ پڑا۔

''تم سچ کہہ رہی ہو۔ تم سب بھول جاتی ہو۔ تم بھول گئیں کہ تم نے تباہ کاری، ہلاکت خیزی اور فنا کا کیسا بھیانک کھیل دنیا میں رچا رکھا ہے۔ کیا تمہیں ہر زلزلے ہر طوفان کے کاندھوں پر بیٹھ کر سیر کرنے کی عیاشانہ عادت نہیں۔ اولاد آدم کو نیست و نابود کر دینے میں تم نے کون سی کسر چھوڑی ہے۔ قحط کی بھیانک خشکی اور بھوک کو اور باڑھ کے کالے پانی، دونوں کو تم نے اس طرح مزے لے کر کھایا جس طرح فحش ہونٹوں والی عورتیں چاٹ یا آئس کریم کھاتی ہیں۔ اور...... اور وہ جنگیں، وہ فساد جن سے شہر اور قومیں جلتی رہیں، تم اس آگ کی روشنی میں ننگی ہو کر دیوانہ وار ناچیں...... وہ وبائیں، وہ بیماریاں اور وہ جراثیم، ان سب میں تم ہی تو اپنا ٹھکانہ بناتی ہو۔ یہ سب بہانے ہیں۔ تم کو واقعی کچھ یاد نہیں۔ تمہیں میرا غریب باپ بھی یاد نہ ہوگا جو صرف اس لیے مر گیا کہ بلغم اس کے حلق میں اکٹھا ہو کر پھنس گیا تھا اور کمزوری کے باعث اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ کھانس سکے۔ بولو کیا تمہیں کالی سردی کی وہ مہیب رات یاد ہے۔''

وہ دم لینے کو رکا تو دیکھا کہ سایہ کرسی پر اور بھی سمٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

''سردی کو میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ تو میں خود ہوں۔'' سایہ شاید افسوسناک انداز میں

مسکرایا تھا کیونکہ سوکھی جھاڑی بائیں طرف کو جھک رہی تھی۔ افسوسناک مسکراہٹیں ہونٹوں کے بائیں کونے پر ہی پھسلتی ہیں۔

"چپ رہو۔ شیطان کی اولاد۔ تم کیسے بھول سکتی ہو کہ میرے بیٹے کو چاقوؤں سے گود کر صرف اس لیے ہلاک کر دیا گیا کہ اس نے ایک غیر مذہب کی دلت لڑکی سے شادی کی تھی۔ ان بھیانک اور فحش چاقوؤں کے دستوں پر تم نہیں براجمان تھیں تو اور کون تھا؟ میں وہ منظر نہیں بھلا سکتا کیونکہ چاقوؤں سے بنائی گئی لکیروں سے ہی وہ تصویریں تین جہتی بن جاتی ہیں اور یہ گیند دیکھو۔ وہ ادھر کونے میں رکھی لکڑی کی ہرے رنگ کی گیند۔ میرے پوتے کی ہے۔ وہ چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا صرف آسمان کو دیکھتا ہوا اور بے خیالی میں آہستہ آہستہ الٹے پاؤں پیچھے کی طرف کھسکتا ہوا وہاں تک جہاں سے چھت کی منڈیر ختم ہوتی تھی، تم پتنگ کے نیلے کاغذ اور شیشے سے بنے بھورے مانجھے کو تھام کر چھت پر اتر آئیں۔ اس کی عمر صرف سات سال تھی۔"

بولتے بولتے اسے محسوس ہوا جیسے اس کے حلق میں ڈھیر سا بلغم بن گیا ہے۔ اس نے کھانسنا چاہا مگر ایک ناقابل فہم قسم کے احساس جرم نے اسے کھانسنے سے روک دیا۔ اس کی پیٹھ کے نیچے بستر پر سردی کا بونڈر سا اٹھا اور سردی اس کے حلق، سینے اور آنتوں میں بھرتی چلی گئی۔

وہ شاید رونا چاہتا تھا اور سوکھی جھاڑی کے سائے نے اسے بھانپ لیا۔

موت کرسی سے اٹھی۔ اس نے اپنے کھرے جیسے ہاتھوں سے اس کی آنکھوں کے آنسوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہی کیونکہ سڑا گلا پانی آسانی کے ساتھ گھر کی بند موری سے باہر نہیں نکلتا۔

"دیکھو۔ میں تمہارے گلے شکوے اور گالیاں سننے یہاں نہیں آئی۔ تمہارا سارا علم ایک قسم کی داخلی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ تم انسانوں نے اپنی ساری زبان اور ساری دانش کو استعارے کی دلدل میں دفن کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔"

اپنے ان منحوس اور حاسد ہاتھوں کو ہٹاؤ۔ مجھے ان کی ہمدردی نہیں چاہیے۔ وہ تقریباً چلا کر کہنا چاہتا تھا مگر سخت سردی کے باعث اس کے دانت کٹکٹانے لگے اور اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک مایوس کن بن کر دانتوں اور زبان کے درمیان گردش سی کر کے رہ گئی۔

سوکھی جھاڑی کی پرچھائیں اداس ہو کر واپس کرسی پر، اپنی جگہ آبیٹھی۔ کمرے کے اندر سردی کا دورہ ایک بار پھر کم ہونے لگا۔ موت نے سپاٹ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

اس طرح پاگل مت بنو۔ پاگل پن وہ کام کا ہوتا ہے جس میں کچھ پالیا جائے۔ اس طرح کے پاگل پن میں ہمیشہ صرف کھو دینے کا یقین ہی رہتا ہے۔ اس لیے اپنا سچا اظہار کرنے کی کوشش کرو جو ایک مقدس پاگل پن ہے۔ موت کو لعن طعن اور بدنام کرنا تم انسانوں کی اداکاریاں ہیں۔ یہ صدیوں سے چلی آرہی ہیں اور اس تماشے نے بڑے پائے کے اداکار پیدا کیے ہیں۔ مگر کیا اب تم واضح طور پر یہ محسوس نہیں کرتے کہ انسانوں کا رول اب ختم ہو چکا ہے۔ دنیا کو اس رول کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی اور اس کی دلچسپی انسانوں میں تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے کیسی بے تکی اور شرمناک بات ہے کہ کھیل اور کردار ختم ہو چکا ہے مگر اس کے بعد بھی تم اسی مکھوٹے کو، اس چیتھڑے چیتھڑے اور سڑے ہوئے مکھوٹے کو منھ پر لادے چلے آتے ہو۔ اگر تمہاری ناک صحیح طور پر کام کر رہی ہے تو کیا تم اس مکھوٹے کے اندر سے آتی بدبو کو نہیں سونگھ رہے ہو؟"

اس نے اپنے پاجامے کو کمر پر درست کر لیا اور بدلی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"وہی جو سننے کے لیے تم نے مجھے پکارا تھا۔وہاں خلاؤں میں۔"

"میں نے اپنی موت کو پکارا تھا۔تم نہ جانے کہاں سے چلی آئیں۔تم کس کی موت ہو؟"

"یہ ابھی مجھے نہیں معلوم ہوسکتا ورنہ بتادیتی۔مگر اگر تم اس ملاقات کو بامعنی بنانا چاہتے ہو تو جیسا کہ میں نے کہا ہے،وہ کرو۔"

"کیا؟"

"اپنا اظہار کرو۔اپنے وجود کا ترجمہ کرو۔اپنی روح کی زبان میں بات کرو کیونکہ ابھی وہ تمھارے جسم کے اندر ہے اس لیے تمھارے حلق کے غدود، تمھاری زبان کا لوتھڑا، تمھارے جبڑوں کے عضلات اور دانتوں کے درمیان کی ہوا، اس روح کی زبان کا ساتھ دے سکتے ہیں جو ابھی تمھارے جسم کو خالی کر کے نہیں گئی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ میں تمھارے ساتھ کس زبان میں گفتگو کروں؟" اس نے زچ ہو کر کہا۔

"ٹھہرو میں بتاتی ہوں۔اپنے اندر کسی نشان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔آخر انسانوں کی ساری زبانیں ایک دوسری ٹھوس مگر نادیدہ زبان سے منسلک ہوتی ہیں۔یہ وہ زبان ہے جو استعارے جیسی کسی اپاہج کی گاڑی کی طرح سڑک پر نہیں گھسٹتی، جس پر فراموشی کی مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں اور دو انسانوں کے وجود کے درمیان بھاری شہتیر لگا دیے جاتے ہیں۔وہ روح کے ناپ کی زبان ہوتی ہے مگر یہ زبان سمجھنے کے لیے انسانوں کو اپنی روزمرہ کی زبان کو ایک دوسرے کے کپڑے پہنانے ہوں گے۔تو آؤ ہم تم ایک دوسرے کی زبان کے کپڑے پہن لیں۔ایک دوسرے سے اپنا لباس تبدیل کر لیں ورنہ ایک "زندہ انسان" اور

'ایک آوارہ بھٹکتی ہوئی موت' کے درمیان چلنے والا مکالمہ یا تو بچوں کو ڈراونی کہانی سنانے کا کام کرے گا یا نابالغ دانشوروں کے لیے کوئی استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ اور رمز بلیغ وغیرہ سمجھنے سمجھانے کے لیے۔شاید ہم ہرگز یہ نہیں چاہیں گے کہ ہماری اس ملاقات اور بات چیت کا ایسا عبرت ناک منظر دیکھنے کو ملے۔"

سوکھی جھاڑی جیسا سایہ اپنے دھوئیں سے بنے گھٹنوں پر اپنا کہرے سے بنا چہرہ جھکاتے ہوئے سرد آواز میں بولا اور اُس کی کرسی نہ جانے کیوں کچھ اور خالی خالی سی نظر آنے لگی۔

"مگر میرے اندر کوئی نشان نہیں...... صرف زخم ہیں۔ان زخموں کے نشان کب بن پائیں گے، مجھے نہیں علم۔میں جب اپنے بارے میں کوئی بات کہنا چاہتا ہوں تو اُس کی پشت ان زخموں سے رستے خون اور مواد سے گندی ہو جاتی ہے۔"

اس نے لحاف میں اپنے پیر سکوڑ لیے۔

"ہر بات کو دوسرے ڈھنگ سے کہو۔جس طرح ہر کہانی کو بالکل ہی دوسری طرح کہنا بھی ممکن ہے۔تم ان زخموں کو اپنی بات کی پیٹھ پر نہیں بلکہ سامنے، یہاں سینے پر لانے کی کوشش کرو، تب ہی شاید یہ زخم بھریں گے اور ان کے نشان بن جائیں گے بلکہ نہ صرف تمھارے، موت کے زخم بھی بھر سکیں......شاید۔"

"موت کے زخم؟"

"ہاں تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔کچھ بھی نہیں اور نہ میرے اندھیروں کے بارے میں" سائے کی آواز اچانک اداس ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گہرے پانی کے اندر سے آرہی تھی۔

اب مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے تمھاری باتیں سننا چاہئیں۔بس یہ میرے پیروں میں ابھی

بھی بہت سردی لگے جارہی ہے۔ یہ جیسے برف کی سلیاں بن گئے ہیں۔"

"اس میں میرا قصور نہیں، یہ میری سردی نہیں۔ یہ ایک دوسری سردی ہے۔"

"کہیں میرے پیروں کا دم تو نہیں نکل رہا ہے؟" وہ سہم کر بولا۔

"نہیں، کیونکہ یہاں آس پاس تمہارے جسم کے خالی ہونے کا انتظار کرتی ہوئی دوسری کسی 'موت' کو میں نہیں دیکھ رہی ہوں مگر مجھے اتنا تو معلوم ہے کہ بہت سے لوگ اس پر یقین کرتے ہیں کہ سب سے پہلے پیروں کا ہی دم نکلتا ہے۔ انسان کو جب نیند آنے لگتی ہے تو بھی سب سے پہلے اس کے پیر ہی سوتے ہیں۔ پیروں کا مقدر بڑا عجیب ہے چاہے وہ زندگی کے ہوں یا موت کے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو" وہ ایک ایسے جوش سے بھر گیا جس میں ملال کا عنصر بھی بہت نمایاں تھا۔

"میرے باپ کے پیروں کا دم تو پہلے ہی نکل گیا تھا مگر ان کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی، میں، دس سال کا ایک بچہ نیلے رنگ کا نیکر پہنے ان کے پلنگ کے پائینتی حواس باختہ کھڑا تھا۔

وہ بھی دسمبر کا ہی مہینہ تھا۔ کالی، بھیانک کہرے سے لدی پھندی راتیں اپنے بے رحم وقار کے ساتھ جس طرح دسمبر میں گزرتی ہیں. وہ کسی کالی پلٹن کا اندھیرے میں مارچ کرنے جیسا ہے۔ ان کی دھمک سے کہرے سے بھیگی ہوئی سڑکیں چٹختی ہیں، ٹوٹتی ہیں۔ دسمبر گواہ ہے، ایک چوکنی اور جاگتی ہوئی آنکھ کی طرح کہ سردی اسی طرح تو چھپتی پھرتی ہے۔ وہ چھپتی پھرتی ہے انسان کے سینے میں، اس کے گلے میں، اس کی ناک کی نوک پر، اس کے پیٹ کی خالی آنتوں میں اور اس کے پیروں کے پنجوں میں۔ تب بلغم بنتا ہے، وہ پھیپھڑوں سے نکل کر

حلق تک تو آگیا تھا اور میری ماں نے میرے باپ کا منھ چیر کر اس میں اپنی انگلی ڈال کر وہ بلغم نکالنا چاہا تھا مگر شاید وہ بلغم نہیں تھا وہ حلق میں ٹھونکی گئی لوہے کی کوئی میخ تھی جو ایک عورت کی کمزور انگلی سے باہر نہیں کھینچی جا سکتی تھی۔ میرے باپ کا دم گھٹ گیا اور ان کی سانس چلنا بند ہوگئی۔

جب میں چیخ چیخ کر رونے لگا تو کسی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

صبر کرو بیٹا صبر کرو۔ ان کا وقت آگیا تھا۔ ان کے پیروں کا دم تو پہلے ہی نکل چکا تھا۔

تب شاید واقعی مجھے صبر آگیا تھا مگر اس واقعے پر مجھے آج تک صبر نہیں آیا کہ کبھی کبھی انسان اتنا مجبور کیوں ہو جاتا ہے کہ وہ کھانس بھی نہ سکے۔ کیا کھانسی پر بھی فالج گر جاتا ہے؟ مگر تمہیں یہ سب سنانے سے کیا فائدہ۔ موت نے میرے باپ کی زندگی چھین لی۔"

اس کی آواز گلے میں رک رہی تھی۔ وہ صرف سانس بن رہی تھی۔ سانس بن کر اس کے سینے کو پھلا اور پچکا رہی تھی۔

"شانت ہو جاؤ۔ دیکھو مہربانی کر کے۔ موت کو اس کا قصوروار مت ٹھہراؤ۔ یہ زندگی چھین لینے کا لفظ تم زندہ انسانوں نے آخر کہاں سے سیکھ لیا ہے؟ بے چاری موت کی کیا اوقات کہ وہ کچھ بھی چھین سکے۔ اس کے غیر مادی دھوئیں جیسے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں۔ یاد رکھو کہ جس طرح ایک زندہ انسان دوبارہ پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح موت بھی ایک جسم میں رہنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اصل میں جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ 'موت' ایک نہیں ہے کہ وہ دنیا کی تمام تباہ کاریوں پر اکیلی حکمرانی کرے۔ اس طرح تو وہ قادر مطلق بن جاتی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ مگر آیا تم میری بات سن رہے ہو یا تمہارا دھیان اپنے ٹھنڈے پیروں کی طرف ہے۔ واقعی انسانی جسم بڑا بے تکا بنایا گیا ہے۔ ورنہ پیروں سے زیادہ

تمہارے پوشیدہ اعضا ٹھنڈے پڑنا چاہیے تھے۔" سوکھی جھاڑی بے چینی کے ساتھ آگے کی طرف جھک گئی۔

"نہیں، اب یہ آہستہ آہستہ گرم ہو رہے ہیں۔تم اپنی بات جاری رکھو۔" وہ دھیرے سے بولا پھر اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

"ہر موت کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔وبا میں ایک ساتھ ہزاروں لوگ مرتے ہیں مگر ان کی موت الگ الگ ہوتی ہے۔موت بھی زندگی کی ہی مانند ہے جو انسانوں کے جسم کو اپنے کام میں لا کر اپنی نسل کی افزائش کرتی ہے۔زندگی ماں کی کوکھ کے اندھیرے پر بغیر کسی جائز حق کے اپنی بساط جما کر بیٹھ جاتی ہے۔کچھ کچھ اسی طرح موت انسان کے خالی ڈبے جیسے جسم میں آکر بوریا بستر لگا لیتی ہے مگر ایک اچھے کرایہ دار کی طرح۔وہ تب ہی جسم کا صدر دروازہ کھولتی ہے جب روح اسے پوری طرح خالی کر چکی ہو۔روح کو قبض کرنے کا کام موت کا نہیں ہے۔یہ تم لوگوں کی غلط فہمی ہے۔موت تو نہ جانے کب سے جلاوطنی کی سزا بھگت رہی ہے۔ہر موت ایک جلاوطن خیال کے مانند ہے جو نہ جانے کب اور کس جرم کی پاداش میں پتہ نہیں کہاں سے دھکے دے دے کر نکال دی گئی تھی۔ایک پراسرار ہجرت اور جلاوطنی کے کبھی نہ ختم ہونے والے اندھیرے ہمیشہ سے موت کا مقدر رہے ہیں۔شاید ازل سے۔ زندگی کے پیدا ہونے سے بہت قبل، جب زمین پر لاکھوں سال بھیانک، کبھی نہ ختم ہونے والی بارش ہوتی رہی تھی، موت اس تمام بارش سے تربتر اور شرابور ہوئے اس پریشان حال مسافر کی طرح ہے جو کسی ویران سرائے میں تھوڑی دیر کو پناہ لینے کے لیے آجاتا ہے اور پھر وہ پناہ گاہ بھی تباہ ہو کر ریزے ریزے۔

میں جو تمہارے سامنے بیٹھی ہوں تو ایک منفرد شخصیت کی مالک موت ہوں۔میرے

ہمزاد اور ہم شکل تمام کائنات میں بے سروسامان بھٹک رہے ہیں۔ اگر چہ ان میں ماہیت اور مزاج کے اعتبار سے فرق بھی ہے جس طرح جڑواں بچوں میں ہوتا ہے۔"

"جڑواں بچے" وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" موت نے چونک کر پوچھا۔

وہ پھیکے انداز میں مسکراتا رہا پھر کہنا شروع کیا۔

"سب سے پہلے میرے دو جڑواں بچے ہی پیدا ہوئے تھے مگر دونوں بس آٹھ دن ہی جی سکے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ اتنے چھوٹے بچوں نے بھی کتنی تکلیف اور اذیت اٹھائی۔ آخر بچوں نے کیوں؟ یہ کیسی دنیا ہے؟

ان کے ننھے ننھے ہاتھ پیر جن کو چھوتے اور چومتے بھی ڈر لگتا تھا ان میں جگہ جگہ ڈرپ لگی رہی اور وہ خون سے تر ہوتے رہے۔ ان کی ابھی ابھی تخلیق ہوئی ریڑھ کی ہڈی سے پانی نکالا جاتا رہا۔ دنیا میں آتے ہی وہ تیز قسم کے پراسرار بخار کی زد میں آگئے۔ آخری دن دونوں کے منھ پر آکسیجن گیس کا ماسک لگا دیا گیا۔ آکسیجن کے ماسک میں ایسا لگتا تھا جیسے وہ مسکرا رہے ہوں یا کلکاریاں مار رہے ہوں جب کہ دراصل وہ مر رہے تھے۔

اس رات ایک چھوٹی سی چٹائی پر سفید کفن میں انھیں لپیٹ کر، اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس قبرستان کی طرف چلا جس کے سامنے پاگل خانے کی دیوار ہے۔ میرے پیچھے پیچھے آٹھ یا دس آدمی گیس لالٹین کی سفید اور رنجور روشنی میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ گھر کے اندر سے میری بیوی کے رونے کی آواز گھر سے ایک میل دور واقع قبرستان تک آتی رہی جب تک کہ شاہراہ پر گزرنے والے ایک تیز رفتار ٹرک کے شور نے اسے اچانک ہی کچل نہ دیا۔

مجھے یہ سب کیوں یاد آ رہا ہے؟ سب کچھ اتنا صاف صاف جیسے کل ہی کی تو بات ہو۔"

سوکھی جھاڑی کا حجم اچانک اس طرح بڑھتا چلا گیا جیسے کسی ربڑ کی ڈوری کو کھینچا جاتا ہے۔ وہ ایک بار پھر ببول کے درخت کا ایک اجڑا ہوا اداس سایہ نظر آنے لگا۔

پھر وہ کرسی سے اٹھا اور دیوار سے لگ کر رونے لگا، مگر اس کے آنسو بے بس تھے۔ وہ بے وجہ ہی اس کے جسم، چہرے اور آنکھوں سے باہر کہیں لٹک رہے تھے۔ دھول یا گرد کے ایک چیتھڑے کی طرح یہ زندگی کے سامنے سلیقے اور قاعدے سے اپنا اظہار کرنے سے معذور تھے۔

موت رو رہی تھی اس طرح جیسے کوئی شیر خوار بچہ رو رہا تھا یا کوئی ناقابل یقین پرندہ۔ اگرچہ اس آواز کے عجیب و غریب ارتعاشات سے یہ گمان بھی پیدا ہوتا تھا کہ جیسے وہ ہنس رہی تھی۔

دیوار پر چپکا ہوا سایہ آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔

چند ثانیے یوں ہی گزر گئے۔ وہ لحاف میں بیٹھا موت کو روتے دیکھتا رہا پھر بستر سے اٹھا۔ قریب آکر اس نے تسلی دینے والے انداز میں موت کے سر پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔ وہ کمرے کی سرد ہوا میں کہیں جھول کر رہ گیا۔

ببول کا سایہ مڑا۔

"کاش کہ میں تمہیں گلے لگا کر رو سکتی" اس نے ایسی آواز میں کہا جیسے بچے توتلی مگر رندھی ہوئی آواز میں کچھ کہتے ہیں۔ "مگر میرے پاس کوئی جسم نہیں ہے۔ گلے مل کر رونے کے لیے دو جسم ہونا ضروری ہیں۔"

وہ مایوس کن انداز میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا اور لحاف سے خود کو ڈھک لیا۔ "میں نے اپنی چھیڑ کر تمہیں رنجیدہ کر دیا۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ ندامت سے بولا۔

ببول کا سایہ دوبارہ ایک سوکھی جھاڑی میں بدل گیا اور تقریباً گھسٹتا ہوا واپس آکر اس کرسی پر بیٹھ گیا جس کو اس کے بیٹھنے کے باوجود آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کمرے میں صرف سناٹا رہا بس دیوار پر ٹنگا ہوا بڑی بڑی تاریخوں والا ایک کلینڈر ہلتا رہا۔ دراصل اس کلینڈر پر ایک چوہیا چڑھ رہی تھی۔

پھر سائے نے ہی اس جمود کو توڑا۔

"بات یوں ہے کہ ساری گڑبڑ تمھارے جسم کی پیدا کردہ ہے۔ موت بذات خود اس کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ موت تو ایک جھوٹی دھمکی سے بھی زیادہ کمزور اور حقیر ہے۔ اس کی کوئی اوقات نہیں۔ موت سے کیا ڈرنا۔ وہ تو بالکل خالی شئے ہے ایک دم نہتی۔ وہ محض ایک خالی ہاتھ ہے۔ کراٹے کی طرح۔ جس طرح آدمی کراٹے، یعنی خالی ہاتھ سے ڈر جاتا ہے اسی طرح تم بے وجہ موت سے ڈرتے ہو۔ یقین کرو کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کو قتل بھی کر دیتا ہے تو یہ صرف اس کا ایک خیالی مکہ ہے، منھ پر مارنے کے لیے۔ اس مکے میں کوئی موت نہیں جو وہ اسے سونپ سکے۔ یہ امر اتنا مضحکہ خیز ہے کہ اس پر ہنسنے کے لیے انسان کے حواس واعصاب ابھی تیار نہیں ہیں۔

انسانی جسم ایک بے تکی مشین ہے۔ اس میں پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ موت ایک خوشبو کے سہارے وہاں پہنچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جب سے انسان بنے ہیں، موت اس خوشبو کے بوجھ کو اپنی کمر پر لادے لادے پھر رہی ہے۔ موت کو بھی ایک جسم چاہیے۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ چمگادڑوں کو کھنڈر کی کتنی ضرورت ہے حالانکہ سر بفلک جگمگاتی ہوئی عمارتوں کی روشنیاں اسے کبھی نہیں جان سکتیں۔ موت تو بس خالی جسم میں آکر سکڑ کر اپنا ڈھول اور ریت سے بھرا ہوا سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ جاتی ہے۔ انسان کو تمام تر توجہ اپنے جسم پر دینا چاہیے۔ اس کی

حفاظت کرنا چاہیے۔ مجھے پتہ نہیں کہ تمھاری سائنس اور علم و دانش نے اب تک ایسا کوئی لباس یا خول کیوں نہیں تیار کیا جو بیماریوں، حادثات اور ناگہانیوں سے جسم کو محفوظ کر سکے۔ محض بلٹ پروف، فائر پروف یا غوطے خوری کے لباس کو تیار کرنے سے ہی تو مسئلہ حل ہونے سے رہا۔ مثال کے طور پر حادثات کو ہی لے لو، کوئی کار سیدھی چلتے چلتے درخت سے کیوں ٹکرا جاتی ہے؟ کوئی شخص اپنے غسل خانے میں ہی پھسل کر کیوں گر جاتا ہے؟ کوئی آدمی سڑک پار کرتے وقت کسی بس یا ٹرک سے کیوں کچل جاتا ہے؟'' تم لوگ تو ان سب کے لیے موت کو موردِ الزام ٹھہراؤ گے مگر میں بتاتی ہوں کہ ہر حادثے میں کچھ پراسرار ہوائیں شامل ہوتی ہیں جو جسم سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں اور جسم حواس باختہ ہو کر غلطی کر بیٹھتا ہے۔ موت بے چاری کا وہاں کوئی گزر نہیں۔'' وہ خاموش ہوئی تو فوراً ہی اس نے کہا۔

''سنو خول پر مجھے ایک قصہ یاد آ گیا۔ ایک شخص نے موت سے بچنے کے لیے خود کو شیشے کے ایک خول میں بند کر لیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ موت کس طرح وہاں آئے گی۔ لوگ اکثر کہتے ہیں کہ موت شیشے اندر داخل نہیں ہو سکتی اور یہ بھی کہ شیشے میں آسیب یا بلا اپنی اصل شکل میں ہی نظر آتے ہیں۔ پھر ہوا یہ کہ جب موت آئی تو وہ شیشے کا خول پوری طرح پھٹ گیا اور اس شخص کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی...... تو موت تو کسی بھی شکل میں آ سکتی ہے جیسے شیشے میں وہ کوئی شکل نہ رکھنے کی شکل میں آئی یا جیسے تم یہاں میرے سامنے بیٹھی کئی بار اپنے حلیے بدل چکی ہو۔''

کرسی پر بیٹھی موت جیسے کسی صدمے سے دو چار ہو۔ سوکھی جھاڑی ایک پل کو بالکل ساکت ہو گئی۔ پھر اس نے ایسی آواز میں بولنا شروع کیا جس پر صدیوں پرانے صحراؤں کی ریت اکٹھا ہو گئی تھی۔

''یہ سب لطیفے ہیں۔ لطیفوں سے زیادہ بھیانک کیا کچھ اور بھی ہوتا ہے، کیونکہ یہ انسان کو اس روشنی میں لے جاتے ہیں جہاں دراصل روشنی نہیں ہوتی بلکہ وہاں صرف اندھیرا ادھر ادھر جل رہا ہوتا ہے۔ مہربانی کر کے قبول کرو کہ موت ہر قسم کا شیشہ ٹوٹنے کے بعد ہی اندر آتی ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں اور شیشے تو خود آپ کو ہی توڑنا ہوتے ہیں۔ میں کتنی بار سمجھاؤں کہ موت تو صرف ایک خالی گھر، ایک زمین کے بنجر ٹکڑے کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ وہ تو انسان کے جسم کو اس وقت بھی نہیں چھوتی جب اس کے پیروں کا بھی دم نکل گیا ہو۔ وہ انتظار کرتی ہے۔ صبر کے ساتھ اپنی باری کا انتظار۔ آخر جو کچھ مورتیوں کے لیے معقول اور مناسب ہے وہی کھنڈروں کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ ہماری شکل کیا ہوگی۔ ہم محض سائے، جن پر ہڈیوں، گوشت اور کھال کا کوئی ایسا جھول نہیں جیسا کہ تم اپنی روح پر لادے لادے پھرتے ہو۔ موت تو کم و بیش ایک خیال یا وہم کے مانند ہے جسے کبھی شیشے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ خیال ہی تو ہے جو ہمیشہ سے انسانوں کے اعصاب پر سوار ہے اور وہ اِسے موڑ توڑ کر مسخ کرتے ہوئے دنیا کو تباہ کرنے کا جواز حاصل کرتے رہے ہیں۔''

سوکھی جھاڑی زور زور سے ہلنے لگی تھی۔

''نہیں نہیں۔ غصہ مت کرو۔ میرا مقصد تمہیں یعنی موت کو تکلیف دینا ہرگز نہیں تھا۔''

سایہ کچھ پرسکون نظر آیا پھر اس نے کہا۔

تم ہی بتاؤ کہ آخر جسم مادے کی طاقت سے مالا مال ہوتے ہوئے بھی تمام آفات سے کیوں ہار جاتا ہے؟ وہ ساری ذمہ داری موت پر ہی کیوں ڈال دیتا ہے؟ موت جو ایک غیر معین سایہ ہے۔ ایک بے چارہ خیال، جو صرف جلاوطنی کی سزا بھوگ رہا ہے۔

''اچھا تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کا کیا ہوتا ہے؟'' اس نے گویا

جھپٹ کر بے حد اشتیاق سے سوال کیا۔

''بھلا میں کیا جانوں کہ روح کا کیا ہوتا ہے۔''

''ایک موت علم و فضل کی یہ بلند باتیں جان بھی کیسے سکتی ہے، خاص طور پر جب ان کا تعلق انسان کے اتنے نجی معاملات سے ہو یعنی روح، حیات بعد الموت، ثواب یا عذاب وغیرہ۔ میری رسائی ان مسائل تک نہیں ہے۔ یہ سب تو خدا ہی بہتر جانتا ہے اور کوئی نہیں۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ممکن ہے کہ انسان کی روح اس کے جسم سے نکل کر اسی گلشیئر تک پہنچتی ہو جو موت کے خاموش پانی کے سینے کو زخمی کرتا رہتا ہے۔''

''ایک سوال اور پوچھوں؟ بچپن میں اپنی دادی سے بھی یہی سوال پوچھتا تھا۔''

موت خاموش رہی۔

''مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کیا بھوت پریت کا وجود ہوتا ہے؟ آخر ایک موت کا بدروحوں سے بے حد قریبی تعلق ہونا چاہیے۔'' اس نے سوال تو کر دیا تھا مگر فوراً ہی اسے یہ احساس ہو گیا کہ شاید جلد بازی میں کیے گئے اس سوال نے موت کو ایک بار پھر خفا کر دیا ہے۔

''تم احمقانہ باتیں کرنا کب چھوڑو گے؟ ان سوالات کے لیے کسی عالم فاضل کے پاس جاؤ بھلا موت کا بھوت پریت سے کیا لینا دینا۔ شاید ان بدنصیبوں کی زندگی کوئی دوسری زندگی ہوگی۔ اس گلیشیئر سے الگ، اور کوئی اجنبی گلیئشر جو موت کے کسی دوسرے بیگانے پانی پر تیر رہا ہوگا۔ یا پھر وہ شاید زندگی اور موت دونوں کے وہم کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوں گے۔ دراصل مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وجہ یہ کہ موت کا کوئی بھوت نہیں ہوتا۔'' سائے نے شاید کرسی پر اپنا پہلو بدلا تھا۔

مگر وہ اچانک اداس ہو گیا اور چھت کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اب کیا ہوا؟'' موت نے پوچھا۔

کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ تم نے ٹھیک ہی کہا۔ سب کچھ وہم ہی رہا ہوگا۔ مگر یہ وہم بھی کوئی معمولی شئے یا نظرانداز کردیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ آخر میری بیوی کی روح اس کے جسم میں اس وہم میں پاگل ہوگئی کہ روز رات کو اس کا مقتول بیٹا گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا، بھوک سے بلکتا ہوا اس کے پاس آتا ہے۔ وہ اپنی سوکھی ہوئی چھاتی کھول کر اس کے منھ میں ٹھونس دیتی ہے وہ چسر چسر کرکے اس کا بے رنگ دودھ پیتا ہے، پھر اچانک بڑا اور جوان ہوکر فرش پر گرجاتا ہے۔ اس کا سارا جسم چاقوؤں کے واروں سے چھلنی ہے اور فرش پر خون کا ایک دھبہ لگاتار بڑھتا ہی جارہا ہے مگر وہ اپنی ماں کی طرف دیکھ کر ہنستا رہتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہ سفید رومال دبا ہوا ہے جو بچپن میں اس کی ماں نے اسے ناک پونچھنے کے لیے دیا تھا۔ وہ رومال مٹھی سے نکلتا ہے اور پھر اچانک وہ رومال ہوا میں بڑا ہوکر پھیلنے لگتا ہے۔ پھیلتا ہی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سفید رومال کو کفن کی طرح اوڑھ کر خاموش ہوجاتا ہے۔ میری بیوی چپ چاپ ایک جھاڑو اٹھاتی ہے اور فرش پر پڑے خون کو صاف کرتی رہتی ہے۔''

اس کی آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی تھی۔

سوکھی جھاڑی کرسی سے اٹھی۔ اس نے اپنے کہرے جیسے ہاتھ پھیلائے۔ دھواں بن کر نہ جانے کہاں سے پانی اڑتا ہوا آیا اور ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں حیرت انگیز طور پر سماتا چلا گیا۔ پانی ہی وہ شئے تھی جسے موت پکڑ سکتی تھی، مگر نہیں ایک شئے اور بھی تھی مگر اس کے پکڑنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ موت ہاتھوں کی اوک بنائے بنائے اس کے بستر کے قریب آئی۔

"پانی پی لو" موت کی آواز بھی رندھی ہوئی تھی۔

اس نے موت کے ہاتھوں سے چلّو بھر پانی پیا۔

"ساری راتیں اس طرح گزرتی رہیں۔لوگ کہتے تھے کہ چونکہ میرا بیٹا قتل کیا گیا تھا اور وہ بھی ایک غیر شرعی فعل کی وجہ سے...... اور جو لوگ اس طرح قتل کر دیے جاتے ہیں۔وہ بعد میں بھوت بن کر بھٹکتے ہیں اور دوسروں کو پریشان کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ میرا بیٹا بھوت بن کر اپنی ہی ماں کو تنگ کرنے آدھی رات میں بھٹکتا پھرتا ہے۔" وہ یہ کہتے کہتے رونے ہی والا تھا مگر تب ہی اسے محسوس ہوا کہ اگر اس کے رونے کی آواز بلند ہوئی تو وہ کسی کتے کے رونے کی آواز سے مشابہ ہوگی۔اسے یہ مناسب نہیں لگا کہ موت کے سامنے بیٹھ کر کسی کتے کی آواز میں رویا جائے۔اس لیے رونے کی یہ آواز اس کے حلق سے نہیں نکلی۔وہ آنکھوں سے نکلی، بالکل اس طرح جیسے گندی اور پتلی سی موری میں سے کمزور اور بیمار کتے، بلیاں گھر سے باہر نکل جاتے ہیں۔دبتے دباتے، گھسٹتے، پھنستے اور رگڑ کھاتے۔رونے کی آواز ایک مدھم سے مدھم سرگوشی، آہ یا ہنکار سے بھی حقیر تھی۔اسے صرف دیواروں کے کان سن سکتے تھے یا پھر موت۔خود اس کے کانوں نے بھی اسے انھیں نہیں سنا۔یہ آواز ایک سیال شئے میں بدل گئی تھی۔اس کے سردی سے سرخ ہو گئے گال ان پھنستے ہوئے، رگڑ کھائے اور چھلے چھلائے آنسوؤں سے بھاری ہو گئے۔

مگر یقیناً موت نے اس آواز کو سن لیا اور وہ دہل کر رہ گئی۔اس سوکھی جھاڑی نے اچانک خود کو بڑا کیا۔اب وہ پہلے سے بھی زیادہ بڑے ببول کے درخت کے سائے کی طرح نظر آئی۔شاید وہ اپنے دھوئیں اور اپنے کہرے کے سالموں کی پر اسرار دنیا میں ایک گھنا اور چھتنار درخت بن کر شفقت سے اس دکھ بھرے وجود سے پیش آنا چاہتی تھی مگر حیف کہ ببول کے

درخت کا بڑے سے بڑا سایہ بھی یہ کرپانے سے افسوسناک حد تک معذور ہے۔

''کمینے اور جھوٹے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ تمھارا بیٹا بھوت بن گیا ہے۔'' موت نے چلا کر کہا اور اس کی اپنی ہی آواز کی گونج سے جیسے ببول کے تمام کانٹے اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔

کچھ دیر بعد ببول کا سایہ واپس آیا۔ کرسی پر بیٹھا اور پھر پوچھا۔

''تمھاری بیوی اب کہاں ہے؟''

''وہ اب پاگل خانے میں ہے۔ اسی پاگل خانے میں جس کے سامنے قبرستان ہے جس میں میرے بیٹے کی قبر ہے۔ وہ پاگل خانے کی دیواروں میں بنی ہوئی نالیوں میں سر ڈالے اکثر باہر جھانکنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ نالیاں قبرستان کی دیوار کے سامنے کھلتی ہیں جن سے نکل نکل کر گندا پانی سڑک پر بہتا رہتا ہے اور تیز رفتار ٹرک ہر وقت وہاں سے گزرتے رہتے ہیں۔''

موت کو اچانک اس امر کا انکشاف ہوا کہ زندہ انسانوں کے بھی دکھ واقعتاً بے حد اہم ہیں اور یہ بھی کہ موت اور زندگی کے درمیان ایک دوستانہ تعلق، ایک انسیت بھرا رشتہ یا مکالمہ بے شک قائم ہو رہا تھا۔

تو کیا اب دونوں کی زبانوں نے اپنے اپنے کپڑے ایک دوسرے سے تبدیل کر لیے تھے اور کیا واقعی اب وہ جس زبان میں باتیں کر رہے تھے اس میں استعارے کی بے رحم اور خود پسند گونج شامل نہیں تھی؟

اور یقیناً یہی کرشمہ نمودار ہوا تھا ورنہ وہ ایک دوسرے سے ایک دوسرے کے وجود کی زبان میں ایک لفظ بھی ادا نہیں کر پاتے۔

کمرے کے باہر اتھاہ ویرانی پھیلی ہوئی تھی مگر اب دوہ دونوں شاید اس ویرانی سے بے خبر یا پھر مطمئن تھے۔

''تمھارے بیٹے کے کتنے بچے تھے؟''موت نے دوبارہ مکالمے کا آغاز کیا۔

''بس وہی ایک بچہ جو آسمان کی اونچائیوں میں اڑتی ہوئی پتنگ تکتا ہوا مر گیا۔ایک بار میں اپنے جوان بیٹے کے جنازے کے ساتھ چلا اور دوسری بار بیٹے کے بیٹے کے جنازے کے ساتھ۔اس وقت مجھے ایک ناقابل فہم جرم کا احساس ہوا۔مجھے لگا کہ جیسے میرے بیٹے کی روح اس جرم کے لیے مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ایک بات پوچھوں؟

''پوچھو''موت نے آہستگی سے مگر اداس ہو کر کہا۔

''میں نے سب کی نظروں سے بچا کر اس کی نیلی رنگ کی پتنگ اور تھوڑے سے مانجھے کو اس کے سفید کفن کے اندر چھپا کر رکھ دیا تھا۔میں نے کسی کو یہ بات آج تک نہیں بتائی۔صرف تمہیں یعنی موت کو ہی اپنا ہم راز بنا رہا ہوں......بس مجھے اتنا بتادو کہ کیا مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔کیا اس معصوم بچے کو میری وجہ سے عذاب قبر جھیلنا پڑا ہے؟

وہ یہ کہہ کر عجیب طرح سے اداس ہو گیا جیسے اس کی آنکھ بالکل خالی ہو گئی ہو۔سامنے موت بھی نظر نہ آئی۔آنکھ کا خالی پن اس کے دیدے تک پر نہیں ٹھہرا۔وہ خاموش پانی کی طرح پھیلنے لگا اور موت نے اس مایوس کن حد تک خالی آنکھ کو فوراً محسوس کر لیا۔

''مجھے عذاب قبر کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔دراصل ساری اہم باتیں اور گہرے اسرار تو صرف خدا نے اپنے لیے ہی بچا رکھے ہیں۔یہ اسرار خدا کی شخصیت میں اس طرح پیوست ہیں کہ خدا خود بھی زندگی اور موت دونوں کے لیے سوائے ایک گہرے اسرار کے اور کچھ نہیں رہا۔نہ زندگی ان باتوں کے بارے میں کچھ جانتی ہے اور نہ موت۔تم بھی ان

باتوں کی فکر کرنا چھوڑ دو اور مجھے یہ بتاؤ کہ وہ سامنے لکڑی جو گیند نظر آ رہی ہے وہ تمہارے پوتے کی ہے نا؟''

موت نے اس کے سوال کو ٹال دیا تھا مگر ببول کا سایہ اس طرح ہل رہا تھا جیسے تیز ہوا کا جھکڑ کمرے میں آ گیا ہو۔

''ہاں۔ یہ گیند میرے پوتے کی ہی ہے۔ میں روز شام کو اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔'' اب میں اکثر کمرہ بند کر کے اکیلا اس گیند کے ساتھ کھیلتا ہوں اس امید میں کہ......'' وہ کہتے کہتے رک گیا پھر بے حد مدھم آواز میں کہا جیسے صرف خود سے ہی کہا ہو۔

''اسی لیے تو پوچھا تھا کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے۔''

مگر اس بار موت نہیں جھنجھلائی بلکہ بے حد نرم لہجے میں اس نے ایک غیر متوقع جملہ کہا۔

''میرے ساتھ اس گیند سے کھیلو گے؟''

اسے بھی نہ جانے کیوں چنداں حیرت نہیں ہوئی۔ اسے تو بلکہ یہ محسوس ہوا کہ جیسے یہ قطعی طور پر فطری بات ہے کہ موت ایک انسان کے ساتھ گیند سے کھیلے۔ اسے کھیلنا ہی چاہیے۔ وہ لپک کر لحاف سے باہر آیا۔ کونے میں رکھی لکڑی کی سبز رنگ کی گیند کی دھول کو ہاتھ سے صاف کیا پھر اسے موت کی طرف تانتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

ببول کے درخت کا ایک لمبا سایہ کرسی چھوڑ کر سامنے آ گیا۔ اس نے موت کی طرف گیند پھینکی۔ مگر گیند موت کے قالب سے نکل کر سامنے دیوار پر جا ٹکرائی۔ اگرچہ موت نے اپنے لمبے لمبے، کھرے جیسے ہاتھ گیند کو پکڑنے کے لیے پھیلائے تھے۔

وہ ہنسا ''تم سے نہیں کچھی گئی۔ لاؤ اب اٹھاؤ اسے اور میری طرف پھینکو۔''

مگر موت مایوس اور شرمندہ شرمندہ سی وہیں کھڑی رہی۔

''نہیں میں تمھاری طرح نہیں کھیل سکتی۔ میں اپنے ہاتھوں میں صرف پانی تھام سکتی ہوں یا پھر ایک اور شئے مگر اس کے لیے ابھی میں تیار نہیں ہوں۔''

''تو پھر کیسے کھیلو گی؟''

''تمھاری شرکت کے بغیر، میں اپنے ڈھنگ سے کھیلوں گی۔'' موت نے کہا اور پھر اس نے اپنے آپ کو ایک سوکھی جھاڑی میں تبدیل کر لیا۔ پھر اس نے اپنا جسم اور بھی کم کیا اور بھی کم۔ یہاں تک کہ اب وہ نالیوں کے کنارے اگی بالشت بھر کی سوکھی گھاس کے سائے کی طرح نظر آنے لگی۔ ان نالیوں کا کالا پانی کہیں اور جا کر بہہ رہا تھا۔

نالیوں کے کنارے اُگنے والی یہ خودرو سوکھی گھاس فرش پر پھدکتی ہوئی اور پھر تقریباً لوٹ سی لگاتی ہوئی گیند کی طرف بڑھنے لگی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہاتھ اور پیروں سے معذور اور اپاہج لوگ زمین پر لوٹیں لگا لگا کر گھسٹتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

بالشت برابر کی گھاس نے گیند کو اپنے تنکوں جیسے وجود سے ڈھکنا چاہا مگر گیند کا تیز سبز رنگ اس اڑی اڑی رنگ کی سوکھی گھاس کے سائے کے اندر سے چمکتا ہی رہا جیسے اس نالی کنارے اُگی حقیر اور غلیظ گھاس کا منھ چڑا رہا ہو۔

اور تب بے بس ہو کر گھاس فرش پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے شاید جھینپ مٹانے کے لیے دیوار پر ٹنگے اس کلینڈر پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیا جس طرح کچھ دیر پہلے اس پر ایک چوہیا چڑھ رہی تھی مگر اس بار پردہ نہیں ہل رہا تھا۔ صرف موت کے اندر دھواں اور کہرا اِدھر اُدھر پھیل رہا تھا۔

وہ ہنسنے لگا۔ ''واپس آ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ کھیلنا تمھارے بس کا روگ نہیں ہے۔''

''میں صرف ایک کھیل کھیلنے میں مہارت رکھتی ہوں۔'' موت نے ایسی آواز میں کہا جس میں شرمندگی اور احساس کمتری شامل تھے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ببول کے درخت کے سائے میں متشکل کیا اور واقعی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

''مگر میں نے بُو تو سونگھ لی'' موت کو اچانک یاد آیا۔

''کون سی بو؟''

''لکڑی کی۔ درخت کی بو۔ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ گیند پلاسٹک کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ اس میں سے کسی ہرے بھرے درخت کی بو آرہی ہے ایسا درخت جس پر بہت سے پرندوں کا بسیرا ہو۔ مگر تمھاری یہ کرسی پلاسٹک کی ہے۔ اس سے مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔''

لیکن اب شاید اس نے نہیں سنا۔ وہ صرف درخت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''کہاں کھو گئے؟'' موت نے ٹوکا۔

''پتہ نہیں تم یقین کرو یا نہیں کہ اس لڑکی کے جسم سے درخت کی خوشبو آتی تھی۔''

وہ اسی طرح کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ کمرے کی سردی اچانک روشن ہوئی، اس کا چہرہ دمکنے لگا۔

''کون لڑکی!'' موت نے حیران ہو کر سوال کیا۔

وہ جھنجلا گیا۔

''تم اتنا بنتی کیوں ہو۔ تمہیں جیسے کچھ خبر ہی نہیں جب کہ مشہور ہے کہ تم ازلی اور ابدی ہو اور زندہ انسانوں کی گھات میں ہر وقت لگی رہتی ہو۔ انسانوں کا مقدر تمھارے سامنے اس طرح رکھا ہوتا ہے جیسے قصائی کے پاس۔ اس کی دکان میں رکھا ہوا خون سے لت پت کلیجہ۔ تم زندگی سے احسان فراموشی کرتی رہتی ہو کیونکہ تم اس کی حرام کی اولاد ہو مگر تم کو کم از کم یہ فراموش نہیں

کرنا چاہیے کہ آخر زندگی ہی نے سب سے چھپا کر تمہیں الگ لے جا کر دودھ پلایا تھا۔“

کرسی پر بیٹھا موت کا ہیولیٰ دکھ بھرے انداز میں سمٹ کر رہ گیا۔”دیکھو تم پھر بہک رہے ہو۔میں تو اپنے بارے میں ہی زیادہ کچھ نہیں جانتی۔زمانے کے بہت سے الٹ پھیر میں نے دیکھے ہی نہیں۔اب پتہ نہیں کہ زندہ انسان کے وقت کے تصور اور موت کے وقت کے درمیان کیا فرق ہے۔مگر میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے خود کو بھٹکتا ہوا ہی پایا ہے۔میں شاید اپنے قافلے سے بھی بھٹک گئی ہوں۔ایک ایسے پریشان حال چوپائے کی طرح جو اپنے ریوڑ سے الگ ہو گیا ہو۔“

موت کی آواز گہرے کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔اسے پشیمانی ہونے لگی کہ بے وجہ اس نے موت کا دل دکھایا۔بھلا موت اس کے لڑکپن کی ایک اول جلول محبت کی کہانی کو کیا جانے۔

”مجھے افسوس ہے۔میری بات کو دل پر مت لو۔میں کچھ سنک گیا ہوں۔عمر کا تقاضہ ہے۔میں اس لڑکی سے محبت کرتا تھا۔وہ ہمارے گھر کے سامنے رہتی تھی۔غریب ہم لوگ بھی تھے مگر وہ لڑکی ہم سے بھی زیادہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ہماری چھتیں آمنے سامنے تھیں۔وہ اکثر صبح اور شام کے وقت کسی بہانے سے چھت پر آتی تھی۔میں اپنی کتابیں چھت پر لے گیا اور وہیں پڑھنا شروع کر دیا۔وہ مجھے بہت غور سے دیکھتی تھی۔اس کا قد بہت لمبا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کی ٹانگیں بہت لمبی اور پتلی پتلی سی تھیں۔میں نے اسے ہمیشہ شلوار کرتے میں ہی دیکھا۔چھت پر کبھی کبھی بہت تیز ہوا چلتی جس میں اس کی شلوار اس طرح ہلتی جیسے وہ کسی کے جسم یا ٹانگوں پر پہنی ہی نہ گئی ہو۔وہ آزاد ہوا میں پھڑپھڑاتی۔یہ کتنی خوبصورت بات تھی۔تھی نا؟“

اس نے موت کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ مگر موت بے دلی کے ساتھ خاموش رہی۔ شاید وہ انسانوں کے اس جذبے کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

اس نے موت کی خاموشی کی پرواہ نہیں کی اور دوبارہ بولنا شروع کیا۔

"ان دنوں میں نے ایک کتا پالا تھا۔ پالا کیا تھا بس وہ یوں ہی ہمارے گھر کے دروازے میں آکر بیٹھنے لگا تھا۔ اس کا سارا جسم سفید تھا۔ مگر سر پر کالے رنگ کا گول پٹہ پڑا تھا جو اسے بہت بھولا اور خوبصورت بناتا تھا۔ میں گھر والوں کی نظروں سے بچا کر روز اسے روٹی کے نوالے کھلایا کرتا تھا اور چھت پر کھڑی وہ لڑکی یہ دیکھ کر مسکراتی تھی۔

ایک روز کتے نے خون کی ایک لمبی سی قے کی اور میرے دروازے کے کونے میں دم توڑ دیا۔ کسی نے نہ جانے کیوں گوشت میں شیشہ ملا کر اسے کھلا دیا تھا۔ بے زبان جانور کی آنتیں کٹ گئی تھیں۔ میں اس کتے سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ کتا جو مٹی کے ڈھیر میں پڑے روٹی کے نوالوں کی ساری تاریخ اور ان کا سارا دکھ جانتا تھا۔ گھر والوں کو بھی اس بات کا پتہ نہیں چلا کہ میں نہ جانے کتنی دیر تک کتے کی لاش پر گر کر سسکتا رہا اور میرے قدموں کے نیچے خون کی لکیر بڑی ہوتی رہی۔ تب اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اٹھایا۔ وہ نہ جانے کیسے وہاں آ گئی۔ شاید اسی طرح فرشتے آسمان سے اترتے ہوں گے۔ اس نے مجھے کتے کی لاش کے اوپر سے اٹھایا اور مجھے لپٹا لیا۔ وہ مجھ سے لمبی تھی۔ میرا سر اس کے سینے سے لگا ہوا تھا اور میرے کان وہاں ایک ایسی آواز سن رہے تھے جو کسی برتن میں پانی ابالتے وقت آتی ہے۔ اس کی ناک (جو طوطے کی طرح تھی) کے نتھنوں سے گرم گرم بھاپ نکل کر میرے سر کے بالوں کو نم کر رہی تھی۔ اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم سے ایسی خوشبو آ رہی تھی جو درخت کے تنے سے آتی ہے۔

میں شاید کسی لمبے درخت سے لپٹا ہوا تھا۔ انسانی جسم کی خوبصورتی کی معراج یہی ہے کہ وہ کسی درخت میں بدل جائے۔

اس کے بعد ہم دونوں روز ملنے لگے۔ مجھے اس لڑکی سے اتنی محبت ہوگئی جتنی کہ اس کتے سے تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکیں گے مگر اب مجھے اس کا چہرہ بھی یاد نہیں۔ صرف وہ طوطے کی ناک یاد ہے یا پھر یاد ہے تو اس کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی جس پر کبھی بجلی کا ننگا تار چھو گیا تھا۔ وہاں ایک سوراخ ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے دکھایا کہ اب بھی کبھی کبھی اس سوراخ سے کالے رنگ کا خون رسنے لگتا ہے۔ شاید یہ کوئی ناسور تھا مگر ناسور کا آپریشن کرانے کے لیے غریبوں کے پاس پیسہ کہاں ہوتا ہے۔ تب اکثر میں اس ناسور کو چوم لیا کرتا تھا۔

پھر ایک دن آیا جب وہ اس ہتھیلی پر مہندی لگا کر آئی۔ بے حد سستے قسم کی اور پھوہڑ پن کے ساتھ لگائی گئی اس مہندی میں وہ ناسور چھپ گیا تھا مگر اس نے بتایا کہ اس وقت بھی اس میں سے وہ کالا خون رِس رہا تھا۔ اس کی مہندی گندی اور کالی ہوتی جارہی تھی۔

اس نے مجھے آخری بار لپٹایا۔ اس کی طوطے جیسی ناک میں ایک بڑی سی نتھ پڑی ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا جیسے ایک طوطا پنجرے میں پھڑپھڑا رہا ہو۔

تب میں نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگیں پہلے سے بھی زیادہ لمبی اور پتلی ہوگئی ہیں۔ وہ کچھ چمک دار اور بھاری بھاری کپڑوں میں پتہ نہیں کہاں جا کر دبک گئی تھیں۔

اس کے بعد میں نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اگر زندہ ہوگی تو مجھ سے بھی زیادہ بوڑھی ہوگئی ہوگی۔ وہ جس نے مجھے کتے کی لاش کے اوپر سے اٹھایا تھا، دوبارہ کبھی لوٹ کر نہ آئی اور میرے اوپر کیسا کیسا وقت آ کر گزر گیا۔

مگر میں نے بھی ہمیشہ کے لیے درختوں کے آس پاس سے گزرنا چھوڑ دیا۔" بولتے بولتے اچانک اس کی آواز میں دراڑ پڑگئی اور کمرے کی سردی پھر سے تاریک ہوگئی۔

موت حیران و پریشان تھی۔ وہ محبت نام کے دکھ کو بالکل نہیں جانتی تھی مگر انسانوں کے حیرت انگیز مصائب سے اس کا کہرے جیسا قالب لرز کر رہ گیا تھا۔ بڑی کوشش کے ساتھ موت کے منھ سے لفظ ادا ہوا۔

"اب بھولنے کی کوشش کرو۔ سوچا مت کرو زیادہ۔ دنیا ایسی ہی جگہ ہے۔ یہاں سب کچھ بدلتا رہتا ہے یا بدلا بدلا نظر آتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا دراصل ایک اصلی روشنی میں بنائی گئی ہے اس لیے اس کی تصویریں اپنا رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ کاش کہ خدا نے دنیا کو ایک مصنوعی روشنی میں بنایا ہوتا جس طرح اکثر تمھارے سمجھ دار مصور اپنی تصاویر ایک نقلی روشنی میں بناتے ہیں تاکہ وہ سورج کی روشنی میں اپنے شیڈ نہ تبدیل کرسکیں۔ اب وقت کے ساتھ بہتے بہتے یہاں تک تو آہی گئے ہو۔ باقی بچا ہی کیا ہے، دماغ پر بوجھ مت ڈالو۔"

اس نے موت کی بات سنی۔ ایک بار لحاف میں منھ ڈھانپا پھر فوراً ہی نکال لیا۔ لحاف کے اندھیروں میں بڑی گھٹن تھی۔ "تم یہ ہرگز مت سمجھ لینا کہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا" اس کے تیور نہ جانے کیوں بدل گئے۔ "ہاں مگر میں مرنا تو چاہتا تھا۔ دونوں باتوں میں فرق ہے نا؟ ادھر کئی سالوں سے میرے بہت سے دوست بھی مر گئے ہیں۔ بہت سے رشتے دار اور پڑوسی بھی۔ ویسے بھی اب میں اپنی بہو کے اوپر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ شاید وہ میرے لحاظ میں ہی ایک بیوہ کی زندگی گزارے جا رہی ہو۔ اسے اپنے شوہر اور بیٹے کے مرنے کے بعد ایک عجیب وغریب قسم کا مرض لاحق ہوگیا ہے۔ وہ دن رات باورچی خانے میں گھسی رہتی ہے۔ طرح طرح کے بے تکے کھانے پکاتی رہتی ہے اور پھر وہیں الٹیاں کرنے لگتی ہے بلکہ الٹیاں

کرنے وہ جاتی ہی صرف باورچی خانے میں ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ آنتوں کا مرض نہیں بلکہ کوئی دماغ خلل، دیکھو...... دیکھو۔ اب بھی شاید وہ باورچی خانے میں الٹی کر رہی ہے۔ یہ آواز سن رہی ہونا۔" وہ کانپتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ یہ باہر ہوا کا شور ہے۔' موت نے انکار کیا۔

"کیا مذاق کرتی ہو۔ کیا ہوا کا شور کسی کے حلق سے باہر آتی قے یا اُلٹیوں سے مشابہ ہو سکتا ہے؟" وہ بگڑ کر بولا۔

"ہاں یقیناً ہو سکتا ہے۔ تم ہواؤں کے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ وہ کسی بھی شے سے مشابہ ہو سکتی ہیں۔ رونے سے، ہنسنے سے، پاگل ہونے سے اور خودکشی سے بھی۔" موت نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"مگر میں خودکشی نہیں کر رہا تھا۔ خودکشی ناپاک ہے۔" وہ پھر اپنی بات پر اڑ گیا۔

"نہیں دراصل ہر شے پاک ہے مگر ہر شے کو دکھ بھوگنا ہوتا ہے۔" موت نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

اس کو موت کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ کچھ جواب دینا چاہتا تھا مگر بجائے اس کے، اس نے احتجاجاً لحاف میں سے اپنے سوجے ہوئے پیر باہر نکال کر موت کی طرف کر دیے۔

"اپنے پیر سامنے سے ہٹاؤ۔ مجھے زندہ انسانوں کے پیروں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ اتنے بھاری اور سوجے ہوئے ہوں۔ کیا تمہیں فیل پا کا مرض لاحق ہو گیا ہے؟" ببول کا سایہ کرسی پر بے چینی سے ہلنے لگا۔

وہ طنزیہ انداز میں ہنسا اور اپنے پیر لحاف کے اندر سکیڑ لیے۔ "مجھے خودکشی کے بارے میں

تباؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس بارے میں مجھ سے بہتر جانتی ہو۔" اسے بھی جیسے خبط ہوگیا تھا۔

"لوگ خودکشی کیوں کرتے ہیں۔ افسوس کہ ایک موت اس بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی کہہ پانے پر قادر نہیں ہے مگر اتنا تو صاف ہے کہ وہ اپنے ارادے اور مرضی سے اپنے جسم میں کچھ گڑبڑ کردیتے ہیں۔ اسی طرح ایکسیڈنٹ میں کچھ ہوائیں شامل ہوتی ہیں جو جسم کی پراسرار ماہیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ موت نہ کبھی خودکشی کرنے والے کے انتظار میں وہاں کھڑی ہوکر اپنا وقت برباد کرتی ہے اور نہ ایکسیڈنٹ کے وقت کسی موڑ پر بیٹھی ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اپنا مکان چھوڑ کر آپ خود کہیں نکل جائیں یا کوئی دوسرا دھکا دے کر آپ کو وہاں سے نکال باہر کرے۔ مکان کو تو ویران ہونا ہی پڑتا ہے۔ تب موت کا کیا قصور کہ وہ وہاں آتی ہے اور کنڈلی مار کر بیٹھ جاتی ہے۔"

"تم خودکشی کرنے والوں کے اعصاب پر سوار ہوجاتی ہو۔ آسیب کی طرح اور حادثے میں مرنے والوں کو بہکا دیتی ہو۔" وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور لحاف کو بے وجہ مسلنے لگا۔

"اب میں انسانوں کے اعصاب کی ذمہ دار تو نہیں ہوں۔ یہی خدا کی مرضی ہے۔" موت اکتا کر بولی۔

"تم خدا کو مانتی ہو؟" اس نے موت سے ایک بچکانہ سوال کیا۔

"میں خدا کو مانتی تو ہوں مگر اسے جانتی نہیں۔ وہ اتنا آسان نہیں جتنا کہ لفظوں میں نظر آتا ہے۔ دنیا میں جو ہڑبڑی مچی ہوئی ہے یہ تو بہرحال خدا نہیں ہے۔ وہ اسرار سے بھرا ہوا ہے مگر اس کے باوجود میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ خدا تنہائی کا دوسرا نام ہے۔ وہ ایک اتھاہ خاموشی ہے۔ یہ خدا ہی تو ہے جو زندگی اور موت دونوں کے وجود کی تنہائی میں چلتے چلتے اچانک جادو یا مایا کے زور سے اسی تنہائی کا پتلا بن کر دونوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ کبھی

وہ او جھل ہو کر دونوں سے چہلیں کرتا ہے۔ تنہائی کے تاشوں سے وہ ایک دلچسپ بازی کھیلتا ہے۔ مگر میری کیا اوقات۔ میں ایک بے چاری، بے گھر، حقیر موت، تم انسان مجھ سے زیادہ بہتر جان سکتے ہیں۔" ہیولی کا سایہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کہرے جیسے لمبے ہاتھ چاروں طرف پھیلائے۔ کمرے میں سردی بڑھ گئی۔ تب اس نے آہستہ سے کہا۔ "مگر سوال یہ ہے کہ انسان بے چارے واقعی اتنے دکھی ہیں اور کتنا تشدد ہے تمھاری دنیا میں۔ انسان تو انسان، پورے کے پورے ملک ہی خودکشی کر رہے ہیں۔ اور اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر تین گھنٹے لگے یا چھ گھنٹے؟ اس لیے تنہائی کا یہ پتلا اپنے ہاتھوں سے تاش کی گڈی نکال کر کب پھینکے گا اور اپنے اسرار کو کب عیاں کرے گا؟ دنیا، زندگی اور موت سب کی تقدیر تو غارت ہو چکی ہے۔ اس لیے آخر کب؟ اب نہیں تو کب؟"

موت کے ہیولے نے خاموش ہو کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ جس طرف کو جاتا ادھر سردی کے کالے لوتھڑے گرنے لگتے۔ سامنے وہ لحاف میں دم بخود بیٹھا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک موت نے پھر سخت لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"مگر انسانوں کو موت کے تئیں اپنا رویہ بدلنا ہی پڑے گا۔ تمھارے لعن طعن اتنی دیر سے سن سن کر میرے ہیولی کی لکیریں اندر ہی دھندلی پڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ موت یہ کو سنے کب تک سنے؟ جب تک زندگی موت کو نہیں سمجھے گی تب تک 'خدا' ایک اسرار ہی بنا رہے گا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ انسان نے موت سے کتنا غیر انسانی سلوک کیا ہے۔ نروان یا سمادھی میں مجھے ایک عطار کے نسخے کی طرح استعمال کیا گیا۔ ایشور کو حاصل کرنے کا ایک وسیلۂ محض۔ کبھی میرے تئیں حد سے بڑھا رومانی رویہ اختیار کیا گیا اور بجلی قسم کی شاعری سے میری ناک سڑ گئی۔ کبھی میرے اوپر مقولے مشہور ہوئے جن کی حیثیت دیوانے کی بڑ کے سوا کچھ نہ تھی۔

کبھی مجھ سے خوف کھایا گیا، کبھی صرف نفرت۔ کبھی مجھے 'کال' کہہ دیا گیا اور کبھی 'شونیہ'۔ مگر افسوس کہ لفظوں سے باہر نکال کر کبھی میری شکل تک دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی گئی۔

''تم ہی بتاؤ یہ کون سا انصاف کیا گیا میرے ساتھ۔ کبھی مجھ سے بھی پوچھا گیا کہ آخر تم ہو کیا بلا؟ اور آج تم نے بات چھیڑ ہی دی ہے تو لگے ہاتھوں یہ بھی سن لو کہ مجھے شکایت ہے کہ تم انسانوں کی زندگی کا تو بیمہ بھی ہوتا ہے۔ انشورنس کمپنیوں کے بارے میں، میں نے سنا ہے۔ بہت سے مذاہب میں حیات بعد الموت کا ذکر بھی موجود ہے مگر موت آج تک اپنی ایک بھی انشورنس کمپنی قائم نہیں کر سکی اور نہ ہی ہمارے اوپر مذہبی صحائف اتارے گئے کہ موت کے فنا ہونے کے بعد ایک دوسری موت کا وعدہ کیا جاتا۔ موت کی مکتی کی بابت بھی سوچا جاتا۔ موت کو صرف مکتی کا وسیلہ ہی مانا۔ بس اتنا ہی۔''

چند پل کو خاموش ہوئی تو وہ سامنے بیٹھا ہنستا ہوا نظر آیا۔

''بڑی کڑوی مگر دلچسپ باتیں کر رہی ہو۔ اگر گلا سوکھ گیا ہو تو پانی پی لو۔''

''گلا تم انسانوں کا ہوتا ہے اور کثر سوکھا رہتا ہے۔ موت کا کوئی گلا نہیں ہوتا۔'' ببول کا سایہ دیوار کی طرف منھ کر کے کھڑا ہو گیا۔

''ناراض موت ہو۔ میں دراصل ابھی شاید تھوڑی دیر کے لیے سو گیا تھا۔ مگر میں نے خواب میں تمھاری ساری باتیں سن لی ہیں۔ اب یہ تو ہے ہی کہ خواب سے جاگنے کے بعد آدمی خود کو احمق یا نکی تو ضرور ہی تصور کرتا ہے اسی لیے مجھے ہنسی آ گئی تھی۔''

ببول کے درخت کا سایہ اس کی طرف مڑا۔ وہ کسی انجانے صدمے سے جیسے اچانک ہی چور چور ہو گیا تھا۔ تب موت نے بہت سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔

''خالی جسم میں آ کر بیٹھ جانے کے بعد بہت زیادہ وقت نہیں لگتا مجھے۔ میرا 'میں' اس

وقت کائنات کی تمام جلاوطن 'اموات' کے گروہ کی نمائندگی کر رہا ہے۔ براہ کرم اسے میرا انفرادی 'میں' نہ سمجھنا۔ میں تمہاری روح کی خالی کی گئی ایک بوسیدہ جھونپڑی میں اسی طرح سر چھپانے کو آ کر بیٹھ جاتی ہوں جس طرح بارش میں بھیگتے ہوئے کتے تمہارے دروازے میں آ کر پناہ لیتے ہیں۔ مگر تمہارے جسم کے اندر بہت گندگی ہوتی ہے۔ آدمی شاید اور کہیں نہیں، صرف آنتوں میں ہی رہتا ہے۔ وہاں اور ہوتا ہی کیا ہے؟ سڑتی ہوئی آنتوں اور بساندھ سے بھرے خون کے جمے ہوئے ڈھیر کے سوا۔ اور تم لوگ سمجھتے ہو کہ بڑا شاندار اور نفیس ٹھکانہ چھوڑ کر گئے ہو۔ مگر پھر بھی موت ایک ازلی جلاوطنی کے دکھ کو بھوگتے بھوگتے مجبوراً اسی سڑتے گلے جسم میں رہنے لگتی ہے جس کی حرارت ہر گھنٹے 10.5 اعشاریہ سیلسیس کم ہوتی جاتی ہے۔ تمہارا جسم موت کا وطن نہیں بن پاتا۔ صرف وطن کی چیتھڑے چیتھڑے ہوتی ہوئی پرچھائیں ہی بن پاتا ہے کیوں کہ وطن آدھی رات کے جنون سے تعمیر ہوتے ہیں۔ افسوس کہ موت اور زندگی دونوں اس جنون سے یکسر خالی ہیں۔

انسانوں کی دنیا کی بے تکی آب و ہوا اس سڑنے گلنے کی ذمہ دار ہے۔ بہرحال کان کھول کر سن لو کہ قبر میں تیرہواں تختہ لگ جانے کے بعد اور چتا میں جلتے ہوئے مردے کے سر کی ہڈی ٹوٹ جانے کے بعد کوئی موت وہاں نہیں رک سکتی۔ قبر کے حبس اور اندھیرے سے میرا دم گھٹتا ہے اور چتا کی راکھ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں سے میری آنکھوں میں جلن اور چبھن ہونے لگتی ہے۔ تب موت کو خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھنا ہوتا ہے اور اپنے افسردہ اور چھالوں سے بھرے پیروں کے ساتھ اس پراسرار سفر کی طرف نکل جانا ہوتا ہے جس کے بارے میں خود اسے بھی کچھ خبر نہیں۔ جس طرح زندگی کو نہیں معلوم کہ اب وہ کہاں جائے گی اسی طرح موت بھی یہ ہرگز نہیں جانتی۔ یہی دراصل موت کی فنا ہے۔ کم و بیش ایک خیال کی فنا

کے مانند۔"

موت شاید صرف اپنی سانسوں میں کچھ اور دھواں بھرنے کے لیے رکی تھی۔ فوراً ہی اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

"زندگی محبت کرتی ہے، شادی کرتی ہے۔ بچے پیدا کرتی ہے مگر موت کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ آخر آتی کہاں سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بیکراں خلاؤں میں موت کا کوئی برفیلا دہانہ یا گلیشیئر ہو جہاں سے پھوٹ کر وہ ایسے بھٹکا پھرتی ہے جیسے زمین پر نہ جانے کتنے دریا اور ندی نالے بھٹکتے پھرتے ہیں۔"

ببول کے درخت کا سایہ آہستہ سے کانپ کر رہ گیا۔ وہ بستر پر ساکت و جامد بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا پھر سو رہے ہو؟" موت نے مایوسی سے پوچھا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ مگر سنو تم یہ بھی تو دیکھو کہ موت کے لیے جنت اور جہنم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ تمھاری خوش قسمتی نہیں تو کیا ہے کہ تم ہر قسم کے عذاب سے بچ گئی ہو۔" اس نے موت کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"اگر یہ خوش قسمتی ہے تو میں اس شرمناک خوش قسمتی کا اعتراف کرتی ہوں مگر زندگی سے بغیر کوئی حسد کیے میں اس خوش قسمتی کے تمغے کو اپنے سینے پر بھی نہیں لگا سکتی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور......" موت نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا"؟ اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے وہ غنودگی کے عالم میں تھا۔

مگر موت نے بدبدا کر آہستہ سے کچھ کہا تھا اور شاید اس نے یہ کہا تھا کہ زندگی کی طرح، موت کبھی گناہ گار نہیں ہوتی۔ اصل میں وہ حقیقت مطلق کی طرح اکیلی اور ازلی تنہائی سے چور چور ہے جسے انسانوں کے ساتھ رہنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ کیونکہ موت زندگی کی ہی ناجائز

اولاد......!

مگر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا جملہ حرف بہ حرف یہی تھا اور اگر تھا بھی تو کم از کم اسے سامنے بستر پر لحاف میں دبکے ہوئے آدمی نے ہرگز نہیں سنا۔ کمرے میں سردی کی شدت زیادہ محسوس ہونے لگی۔ باہر ہوائیں بے وجہ یا کسی سمجھ میں نہ آنے والی وجہ کے باعث زیادہ تیز ہوگئی تھیں۔ کمرے کا دروازہ ان ہواؤں سے کبھی کبھی اس طرح ہلنے لگتا جیسے باہر کوئی ان سے بار بار لگ کر کھڑا ہوتا ہے اور پھر ہٹ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کاٹھ کے پتلے پردے پر آگے پیچھے جھولتے ہیں جن کو ہلانے والی ڈور نادیدہ ہے۔

ببول کے درخت کا سایہ اس بار کچھ طرح ہلا جیسے کوئی اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب وہ اپنی بات پوری کر چکا ہو۔

"کچھ اور کہنا باقی ہے؟" کرسی پر بیٹھ کر موت نے سکون کے ساتھ کہا۔

"اب کیا کہنا رہ گیا ہے۔ کیسی خوبصورت مضحکہ خیزی ہے۔ ایک کہانی کے مانند کہ میرے اعصاب پر موت سوار تھی اور موت میرے سامنے کرسی پر بیٹھی رہی اور اسی کو میں یہ سب کچھ سناتا رہا۔ اب تو ہم دونوں ایک دوسرے سے اپنے دکھ سکھ کہہ ہی چکے ہیں۔" اس نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا۔

"تمہارا وقت جلد ہی آئے گا۔ میں نے تمہارے ہاتھ پیر اور ماتھا دیکھ لیے ہیں۔ بوڑھا ہونا بہت خوبصورت بات ہے۔ اس میں سے ایک ایسی قدیم خوشبو آتی ہے جو صرف پرانی کتابوں سے ہی مخصوص ہے۔" موت نے سرگوشی کی۔

"میں بھی اب اپنے ہاتھ پیروں کے بڑھتے ہوئے ناخنوں سے تنگ آچکا ہوں۔ وعدہ کرو کہ جب میں مروں گا تو تم ہی میرے جسم میں آؤ گی۔ تم جو اتنی ہمدرد ہو۔" اس کا گلا

رندھنے لگا۔

"مجھے خوشی ہوتی اگر تمھارے جسم میں کچھ دیر کو آسکتی کیونکہ اس میں اتنی محبت، اتنا دکھ بھرا تھا مگر افسوس کہ ایسا ہوگا نہیں کیونکہ خدا عام طور پر وہ نہیں چاہتا جو زندگی یا موت چاہتی ہے۔ اب تمھاری دنیا کا سورج نکلنے میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہوگا۔ مجھے اس سے پہلے ہی یہاں سے جانا ہوگا۔" موت کی آواز گہری اداسی میں ڈوب گئی۔

"پھر کبھی ملنے تو آؤ گی؟"

"اب شاید پھر کبھی نہ آسکوں۔ ہر آواز ہمیشہ نہیں سنی جا سکتی اور ہر پکار پر ہمیشہ نہیں آیا جا سکتا۔"

"تو آؤ جانے سے پہلے ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر رقص کریں، ایک جشن منائیں۔"

"نہیں میں اپنے ہاتھوں میں صرف پانی تھام سکتی ہوں اور وہ بھی صرف چلو بھر۔ یہ لو اس میں اب ہم دونوں اپنا اپنا چہرہ دیکھ لیں۔"

موت کے ہاتھوں میں پانی آگیا۔ وہ چلو بنا کر لحاف میں بیٹھے آدمی کے قریب پہنچی۔ دونوں نے اس تاریک پانی میں اپنے اپنے چہرے دیکھے۔ اس کے بعد موت واپس کرسی پر آئی اور کہا: "پانی کے علاوہ بس ایک ہی شئے ہے جو میں اپنے ہاتھوں میں مہارت کے ساتھ تھام سکتی ہوں۔ اگر وہ تمھارے پاس ہو تو......"

"کیا؟"

"تاش کے پتے۔ میں تاش کے پتوں سے کھیلنا جانتی ہوں۔"

"میرے پاس ہیں۔"

"تو آؤ۔ الوداع کہنے سے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ تاش کی ایک بازی کھیلیں۔

ویسے بھی دنیانام کے اس جوئے خانے کو ایک دن فنا ہونا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی اور موت کو بھی۔"

سفید کپڑے پہنے بوڑھے آدمی نے خوش ہو کر تقریباً جھپٹتے ہوئے سر کے نیچے رکھے تکیے کے سفید غلاف میں سے بہت پرانی تاش کی ایک گڈی نکالی اور پتے پھینٹنا شروع کر دیا۔
کرسی پر بیٹھا ببول کے درخت کا سایہ عجب انداز میں ہلا۔ اس کے کھرے جیسے لمبے لمبے ہاتھ آگے کو بڑھ آئے۔

ٹھیک اسی وقت ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے سے باہر کوئی بیابان تھا جہاں سے ایک بگولہ سا اٹھا اور کالی سردی کے چاند کو ڈھکتا چلا گیا۔ رات زیادہ پر اسرار اور مٹیالی ہو گئی اور ان کے چہروں پر اس طرح گرنے لگی کہ وہ چہرے لمبوترے ہو کر رات کے اسی ڈھیر میں دب گئے۔
ویسے تو رات کے اس آخری پہر میں اس گھر کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ سب گھروں میں، اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے سو رہے تھے مگر اتفاقاً اگر کسی سوتے ہوئے شخص کا خواب نیند کے ریلے میں بہتا بہتا ادھر، اس گھر کی کھڑکی تک آنکلتا تو وہ یہ صاف صاف دیکھ پاتا کہ دو سائے، ایک انسانی اور دوسرا ببول کا، ایک سفید اور دوسرا سیاہ، ایک دوسرے کے ساتھ تاش کی بازی کھیل رہے ہیں اور کچھ اس طرح جیسے وہ ازل سے ہی یہ کھیل کھیلنے میں محو اور مشغول ہیں۔

• • •
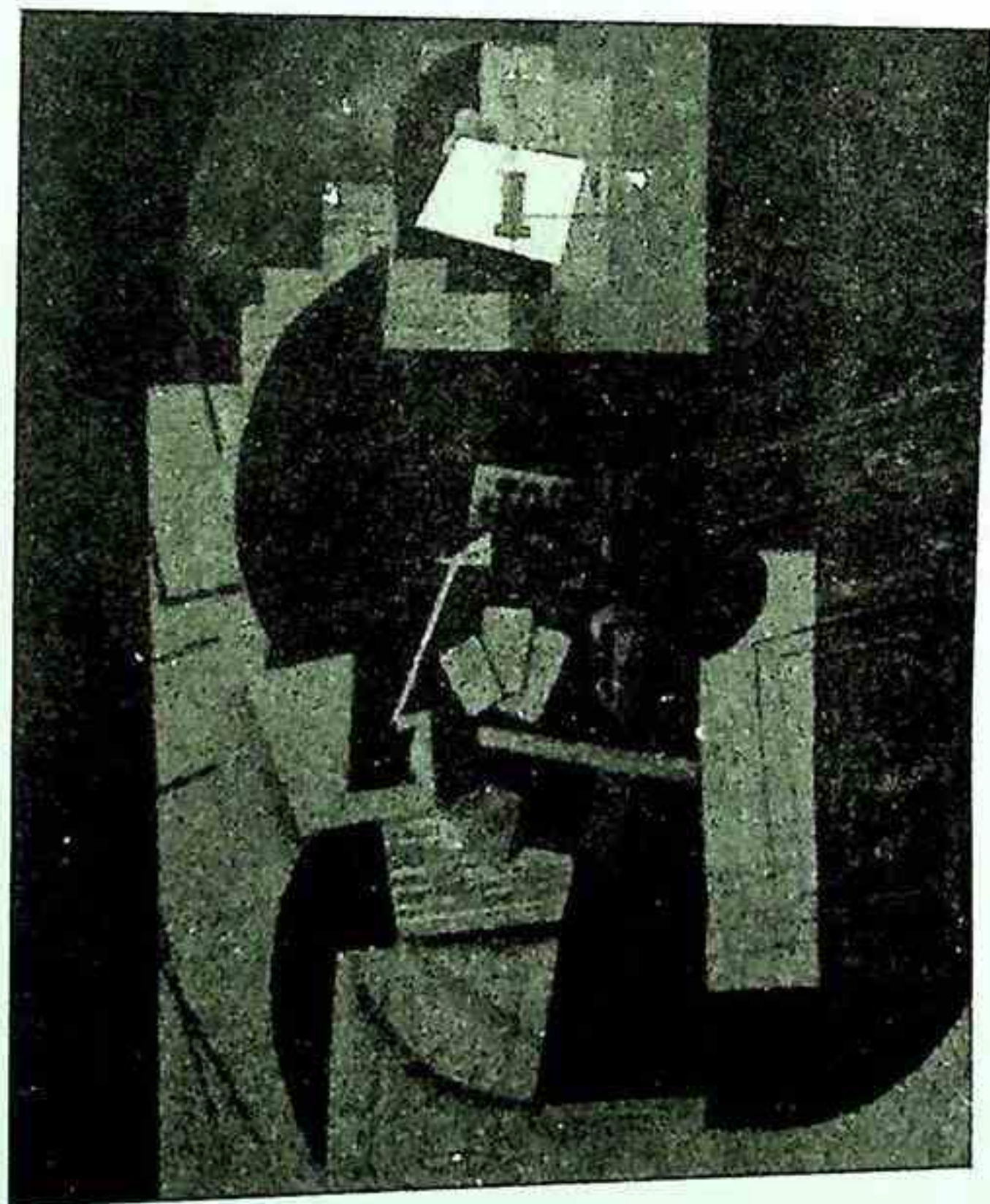
نیند کے خلاف ایک بیانیہ

وہ جو ایک کتے کی طرح گم ہو جائے گا،
آخر میں ایک فرشتے کی طرح دریافت کیا جائے گا۔

(یہودا امی خائی)

(۱)

ڈاک گھر اور ڈاکیے

ادھر کچھ عرصے سے لگاتار چند قصہ گو حضرات کے ساتھ رات کو دیر تک وقت گزارنے کی وجہ سے میرے اندر بھی یہ خبط پیدا ہونے لگا ہے کہ میں کچھ لکھوں۔ یہ خبط یا شوق مجھے زندگی میں پہلی بار ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی بھی نہ ہوتا، اگر چند ماہ پیشتر میری بیوی طاعون کا شکار ہو کر مر نہ گئی ہوتی۔ حالاں کہ جب اسے طاعون ہوا تو وبا تقریباً اپنے خاتمے پر ہی تھی، کیوں کہ محلے کے سرکاری شفاخانے میں اس دن سیاہ دیوار پر چاک سے آخری کراس بنایا گیا تھا۔ سرکاری شفاخانے کی عقبی دیواریں کالے رنگ کی ہیں۔ اس دن، سوائے ایک لڑکھڑاتے

ہوئے مریل سے چوہے کے، جس کے منھ سے خون کی لکیر پھوٹ رہی تھی، دوسرا کوئی چوہا بھی علاقے میں نظر نہیں آیا۔ مگر کسی بھی وبا میں پہلی یا آخری موت بہرحال انفرادی اور امتیازی نوعیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔

مغرب کی اذان کے وقت، جب وہ مر رہی تھی تو اس کا بخار سے تپتا ہوا جسم حیرت انگیز طور سے پسینے چھوڑتے ہوئے ٹھنڈا ہونے لگا۔ میرے دونوں بچے (بڑا تیرہ سال کا ہے اور چھوٹا بارہ کا) پلنگ کے پائنتی بیٹھے اس کے پاؤں سہلا رہے تھے کہ اچانک اس کے منھ اور ناک سے ڈھیر سارا خون باہر آیا۔ میں نے بیوی کے سرہانے سے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے بغلوں میں دیتے ہوئے اسے سہارا دیتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کا سارا جسم شل اور بے جان ہو گیا تھا۔ وہ تو نہ اٹھ سکی مگر میری دونوں ہتھیلیاں اس کی بغلوں میں ابھری ہوئی طاعون کی بڑی بڑی گانٹھوں سے ٹکرا کر رہ گئیں۔ گانٹھوں سے رسنے والی پیپ سے میری انگلیاں گیلی ہو گئیں۔

میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے بے حد کراہیت اور گھن محسوس ہوئی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس وقت اس کے منھ اور ناک سے نکلتے خون اور بغلوں اور رانوں کے درمیان گانٹھوں سے رستے بدبودار مواد کی وجہ سے مجھے اس نیک بخت کی موت کا صدمہ محسوس ہی نہ ہو سکا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ یہ بس آخری بار ہے یعنی یہ گندگی، یہ تعفن اور شب بیداریوں کے سبب جاگتی جلتی آنکھیں جو کہ ایک تیمار دار کا ازلی مقدر ہوتے ہیں۔

مگر میں یہاں اپنی بیوی کے بارے میں یا اس کی بیماری اور موت کے بارے میں یوں ہی لکھ بیٹھا ہوں، شاید اپنے اناڑی پن اور ناتجربہ کار ہونے کے سبب۔ میری سات پشتوں میں بھی کسی نے اپنے بارے میں، اپنی زندگی کے بارے میں یا اپنے احساسات و

جذبات کے بارے میں کچھ نہ لکھا ہوگا۔ میں نہ تو کوئی ادیب ہوں اور نہ کوئی کاتب یا منشی۔ میں تو ایک معمولی ڈاکیہ ہوں۔ جی ہاں! ایک بے حد معمولی اور حقیر ڈاکیہ جس کی انگلیوں کو اس طرح سے قلم پکڑنے کی عادت ہی نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ اگر وہ یعنی گھر والی مر نہ گئی ہوتی تو میں شاید اس وقت گہری نیند سو رہا ہوتا۔ مگر ٹھہریے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ میں نے اس کی موت سے متاثر ہو کر کچھ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ جس طرح میں نے سنا ہے کہ شاعر لوگ کرتے رہتے ہیں۔ میں جو لکھ رہا ہوں، اس کی نوعیت ادبی یا علمی قسم کی نہیں ہے۔

ہوا در اصل یوں ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد میرے لیے رات کاٹنا مشکل ہوگیا ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میں نے اپنی ایک بیوہ بہن کو گاؤں سے بلوالیا ہے۔ میں صبح آٹھ بجے اپنی وردی پہن کر ڈیوٹی کے لیے سائیکل پر گھر سے نکلتا ہوں۔ ڈاک خانے پہنچ کر اپنے حصے کی ڈاک وصول کرتا ہوں، پھر اس ڈاک کو جس میں سینکڑوں چٹھیاں، منی آرڈر، پارسل وغیرہ ہوتے ہیں، سائیکل کے کیریئر پر لاد کر اپنے علاقے میں بانٹنے نکل جاتا ہوں۔ آج کل میرے پاس دادو کا کنواں نام کا محلہ ہے۔ شام کو جب تھکا ہارا گھر واپس آتا ہوں تو سب سے پہلے اپنی وردی اتار کر دیوار پر لگی ہوئی کھونٹی پر ٹانگ دیتا ہوں۔ میرا چھوٹا بیٹا وردی کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہتا ہے۔ خیر اس تفصیل میں جانے سے کیا فائدہ؟ بہر حال جب رات کو کھانے کے بعد گھر سے نکلتا ہوں تو محلے کے کچھ شناسا لوگ مجھے اپنے ساتھ چبوترے پر بٹھا لیتے ہیں۔ ہیں تو یہ بالکل ان پڑھ لوگ، مگر بلا کے قصہ گو۔ یا پھر یوں کہیں کہ اول نمبر کے گپی لوگ۔ آج کل گرمیاں ہیں۔ رات کو یہ سب طرح طرح کے قصے سناتے رہتے ہیں۔ بھوت پریتوں کے قصے، سینما کے قصے، شکار کے اور فاحشہ عورتوں کے قصے۔ میرا وقت واقعی اچھا

کٹ جاتا ہے۔اب ان کی یہ اوٹ پٹانگ قصے سن سن کر میرے دل میں بھی یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہوئی کہ میں بھی کچھ سناؤں یا کہوں۔لیکن میں بڑا جھینپو اور دبو قسم کا انسان واقع ہوا ہوں، اس لیے میں نے سوچا کہ بجائے کہنے کے، کیوں نہ میں کچھ لکھنا شروع کردوں۔ کہنے اور لکھنے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔لکھتے وقت آدمی زیادہ جھوٹ نہیں بول سکتا، جب کہ قصہ گوئی، بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہر قسم کی گفتگو زیادہ تر جھوٹ کا پلندہ ہی ہوتی ہے۔میرا کام تو ویسے بھی لکھے گئے الفاظ کو ہی اِدھر سے اُدھر کرنا ہے۔آخر کو میں ایک ڈاکیہ ہوں نہ۔

اسی لیے اب میں نے سوچا ہے کہ اپنے بارے میں، اپنی زندگی کے بارے میں کیوں نہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔حالاں کہ مجھے یہ بھی علم ہے کہ اپنے بارے میں یا اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بھی لکھنا، میرے لیے شاید ڈاک گھر اور ڈاکیوں کے بارے میں لکھنے کے ہی برابر ہوگا۔ویسے ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو جہاں تک ہو سکے، ذاتی اور نجی باتوں کے بارے میں کم سے کم لکھنا چاہیے۔یہ باتیں ہوتی ہی کیا ہیں سوائے نفرت یا محبت یا پھر غصے یا انتقام وغیرہ کے بارے میں اور ناپختہ تجربوں کے سوائے ان میں کیا ہوتا ہے۔ذاتی یا نجی باتیں بدلتی رہتی ہیں۔وہ تقریباً اس قصے کی طرح ہوتی ہیں جو ہر بار سنانے میں اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ اضافہ، تبدیلی یا ترمیم کر لیتے ہیں۔۔نجی واقعات چاہے وہ کتنے ہی ٹھوس انداز میں کیوں نہ پیش آئے ہوں، ایک نہ ایک دن سفید جھوٹ ہی ثابت ہوتے ہیں۔لہٰذا میرا خیال ہے کہ لکھنے کے لیے اور بہت سی باتیں ہیں، مثلاً ڈاکیوں کی، ڈاک گھروں کی، ریلوے اسٹیشنوں کی، گلیوں کی، محلوں کی وغیرہ وغیرہ۔

تو جب میں اپنی سائیکل پر دن بھر کی ڈاک لاد کر سڑکیں ناپنے چلتا ہوں تو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔پتلی سے پتلی گلیاں، یہاں تک کہ بند گلیاں تک مجھے آسمان پر

جانے والی سیڑھیاں محسوس ہوتی ہیں جن پر گویا میں تیزی سے چڑھتا جاتا ہوں۔ ابھی حال میں ریڈیو پر خبر سنی تھی کہ آدمی چاند تک پہنچ گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مجھے لگتا ہے کہ چاند پر پہنچنے کے لیے اس نے جو سفر طے کیا ہوگا، وہ میرے اس روز کے چٹھی پہنچانے تک کے سفر کے برابر ہی مسرت آگیں رہا ہوگا۔ یہاں میرے اس چھوٹے سے شہر کے آس پاس ندیاں بہت ہیں۔ کبھی کبھی مجھے ان کے کنارے، دلدل پر بھی چلنا ہوتا ہے۔ وہاں میری سائیکل کے پہیے بھی کبھی کبھی دھنس جاتے ہیں مگر مجھے وہ دلدل اس دنیا کی نہیں بلکہ بہشت کی دلدل نظر آتی ہے۔

مگر مجھے علم ہے کہ سب ہی ڈاکیے اس طرح سے نہیں سوچتے۔ بہت سے تو اپنی نوکری کو کوستے بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بارے میں بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں، اتنا تو ہے کہ ڈاکیوں کی نوکری میں خطرے بھی بہت رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ بتاتے ہیں کہ ہر ڈاکیے کے ساتھ میں ایک ڈھول بجانے والا بھی رہتا تھا جو جنگل کے خطرناک راستوں سے گزرتے وقت زور زور سے ڈھول بجاتا رہتا تھا تاکہ جنگلی جانور وہاں سے بھاگ جائیں۔ بہت رات ہو جانے پر ڈاکیے کے ساتھ دو مشعلچی اور دو تیر انداز بھی چلا کرتے تھے۔ میں نے کل اپنے چھوٹے لڑکے کو بتایا کہ ایک بار تو ایسا ہوا کہ ایک ڈاکیے کو شیر اٹھا کر لے گیا۔ ایک ڈاکیہ بے چارہ ندی کی باڑھ کی زد میں آکر ڈوب گیا تھا...... اور بھی کتنے قصے ہیں۔ نہ جانے کتنے ڈاکیوں کو زہریلے سانپوں نے ڈس لیا۔ بہت سے کسی چٹان کے پھسلنے سے یا ملبے میں دب کر مر گئے۔ لٹیروں اور ٹھگوں نے بھی بہت سے ڈاکیوں کو راستے میں لوٹ کر قتل کیا ہے۔ مگر یہ سب پرانی باتیں ہیں، بہت پرانی۔ اب کسی ڈاکیے کو اس طرح کے خطرات کا سامنا نہیں ہے۔

کچھ دنوں سے اپنے چھوٹے لڑکے میں ایک عجیب بات میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اسے

ڈاکیوں کی باتوں اور ڈاک خانوں کے تذکروں میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ میں اس کی طرف سے تھوڑا سا فکرمند بھی ہوں۔ اب میں کیسے لکھوں...... بات تو ہے بے حد ذاتی نوعیت کی مگر لکھ دینے میں بھی کیا حرج ہے۔ اب آدمی اس طرح کی باتیں لکھنے سے بالکل ہی تو بچ نہیں سکتا۔

اصل میں، میرا یہ چھوٹا ان دنوں پیدا ہوا تھا جب شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ یہ خدا کی مہربانی ہی تھی کہ ان دنوں ہمارا گھر وبا سے پوری طرح محفوظ رہا۔ اب سوچا جائے تو یہ بھی بڑی عجیب بلکہ مضحکہ خیز سی بات ہے کہ طاعون کی زد میں آ کر ہی میری بیوی، یعنی اس کی ماں خدا کو پیاری ہوئی اور طاعون کے زمانے میں ہی یہ کم بخت پیدا ہوا تھا۔ بہر نوع، یہ سب تو مشیت ہے۔ اللہ کی جو مرضی۔ ادھر کے اطراف میں تو طاعون پھیلتا ہی رہتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹے کا سر کچھ نہ کچھ چوہے سے ملتا جلتا ہے۔ خیر وہ بھی ایسی کوئی بات نہیں۔ بہت سے لوگوں کے سروں کی بناوٹ کسی جانور کے سر سے مشابہ ہوتی ہے۔ کسی کا سر گھوڑے سے ملتا جلتا ہے تو کسی کا سور کے سر سے۔ مگر بات یہ ہے کہ وہ مجھے دماغی طور پر کچھ کمزور محسوس ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔ ویسے وہ اسکول پابندی سے جاتا ہے۔ (بڑے لڑکے کو تو سوائے محلوں کے لونڈوں کے ساتھ اودھم مچانے کے اور کوئی کام ہی نہیں ہے)

مگر چھوٹا...... وہ آخر اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیلتا کیوں نہیں؟ بس ڈاکیوں اور ڈاک گھروں کے بارے میں پوچھ پوچھ کر میری جان کیوں کھاتا رہتا ہے؟ اور جب میں اسے جو کچھ بھی جانتا ہوں، وہ بتاتا ہوں تو بجائے بچوں کی طرح خوش ہونے کے، کچھ سنجیدہ سا ہو جاتا ہے یا پھر کہیں دور خلا میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔ میں نے اسے ڈاکیوں کے بارے میں بہت سے دلچسپ قصے بھی سنائے ہیں۔ اصل میں یہ من گڑھت قصے ہی ہوں گے، کیوں

کہ انھیں میں بھی اپنے بچپن سے سنتا چلا آیا ہوں۔ مثال کے طور پر جاڑوں کی سرد اور ویران راتوں میں ایک ڈاکیے کا بھوت سنسان گلیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ رات کے ٹھیک دو بجے کسی کا دروازہ کھڑکتا ہے...... ''تار۔ تار''۔ اور جو کوئی بھی اٹھ کر تار لینے کے لیے دروازہ کھولتا ہے، اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے ویران سے ریلوے اسٹیشن پر سال میں ایک رات ایسی بھی آتی ہے جب رات کو دو بجے وہاں پہنچنے والی طوفان میل سے ڈاک کا ڈبہ آپ ہی آپ کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ ٹرین ایک منٹ وہاں رکنے کے بعد روانہ ہو جاتی ہے۔ مگر ڈاک کا وہ کٹا ہوا لال رنگ کا ڈبہ، آپ ہی آپ، بغیر انجن کے اندھیری رات میں خاموش جھاڑیوں سے گھری ویران ریلوے کی پٹریوں میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میرا تو اس اسٹیشن پر جانے کا کبھی اتفاق ہوا نہیں مگر بتانے والے بتاتے ہیں کہ غدر کے زمانے میں بہت سے سرکاری محکموں کے ساتھ ڈاک گھر بھی نشانہ بنے تھے۔ تب، ایک رات جب ڈاک گھر میں آگ لگائی جا رہی تھی، اپنی جان پر کھیل کر کچھ فرنگی ڈاکیے وہاں کی ڈاک کو طوفان میل سے منسلک ڈاک کے ڈبے میں کسی نہ کسی طرح رکھ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر آخری وقت میں انقلابیوں نے ڈاک کے اس لال ڈبے کو ٹرین سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا اور اس میں آگ لگا دی تھی۔ بالکل اسی طرح، جس طرح انھوں نے وہاں تک ڈاک لانے والے فرنگی ڈاکیوں کے سر دھڑ کاٹ کر الگ کر دیے تھے اور پھر ان کی لاشوں کو آگ لگا دی تھی۔

کہتے ہیں کہ تب سے لے کر اب تک ہر سال اسی تاریخ کو رات کے دو بجے، سر کٹے ہوئے اور جلی ہوئی وردی پہنے چند ڈاکیے اسی اندھیرے اسٹیشن پر لالٹین ہاتھ میں لیے

گھومتے نظر آتے ہیں اور طوفان میل سے ڈاک کا ڈبہ کٹ کر ریلوے لائینوں پر اکیلا ہی دوڑتا پھرتا ہے...... ایک حواس باختہ بھوت کی طرح۔

میں اس قسم کے ڈراؤنے اور دلچسپ قصے جب اسے سناتا ہوں تو وہ جواب میں کچھ نہیں کہتا، نہ ڈرا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ ہاں، اس دن ضرور وہ کچھ خوف زدہ سا محسوس ہوا تھا جب قلعے کی کالی ندی کے پُل پر سے مغرب کے وقت اس نے ان لوگوں کو دیکھا جو اپنے پیروں پر بانس باندھے قطار بنا کر گزر رہے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ ان سے ڈرنے کے کیا معنی؟ یہ تو سگریٹ کے کسی خاص برانڈ کے اشتہار کی خاطر مسخرہ پن کے لیے نکلے ہیں۔

ادھر چھوٹے کو دین اور اللہ رسول کی باتوں میں بہت دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ قرآن شریف تو خیر اس کی بُوا نے پہلے ہی اس کو پڑھا دیا تھا۔ مگر فرشتے جس اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور اپنے فرائض منصبی پورا کرتے ہیں، تو اس پورے الوہی نظام سے وہ بہت متاثر معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر جبرئیل علیہ السلام سے۔

جہاں تک بڑے لڑکے کا سوال ہے، تو اسے نہ تو اسکول کی تعلیم سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی دینی تعلیم سے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آوارہ ہوتا جا رہا ہے۔

تقریباً بیس دن سے اس کاغذ پر میں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا دل ہی نہیں چاہا۔ دراصل ہوا یوں کہ چھوٹے کی گردن پتنگ کے مانجھے میں پھنس گئی تھی۔ نرخرہ کٹتے کٹتے بچا۔ خدا نے بڑی خیر کی۔ اس بے چارے کو پتنگ وغیرہ سے کیا کام، مگر اب ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ وہ میرے گھر کے سامنے، کچھ دور نکل کر کالی ندی کا پُل ہے، اس کی

ریلنگ پر دونوں طرف مانجھا بنانے والے مانجھا تانتے ہیں۔ بس وہ گزر رہا ہوگا پُل پر سے۔ اسے ندیاں دیکھنے کا شوق بھی بہت ہے۔ (ندیوں اور کنوؤں کے آس پاس گھومنا خطرناک بات ہے۔) وہیں اس کی گردن تنے ہوئے مانجھے میں پھنس گئی۔ میں تو ڈاک بانٹنے گیا ہوا تھا۔ میری بہن اور محلے کے کچھ لوگ اسے لے کر سامنے والے گھر لے گئے جہاں حال ہی میں ایک سرکاری ڈاکٹر کہیں سے تبادلہ ہو کر رہنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے ہیں۔ انھوں نے ٹانکے لگانے اور مرہم پٹی کرنے کی کوئی فیس بھی نہیں لی۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی بہت اچھی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے چھوٹے کو پڑھنے کے لیے انگریزی کی ایک کتاب بھی دی ہے۔ کتاب پر ان کی بیٹی کا نام لکھا ہوا ہے۔ وہ انگریزی اسکول میں پڑھتی ہے۔ چھوٹے سے دو سال بڑی ہوگی۔ بڑا گول چہرہ ہے اس کا اور بالکل سفید۔ اتنا گول اور سفید چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

مگر چھوٹے کا زخم بھرنے میں بیس دن لگ گئے۔ ٹانکوں میں بار بار مواد پڑ جاتا تھا۔ ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا۔ اس درمیان ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیٹی کو کئی بار ہمارے گھر، چھوٹے کی خیریت کے لیے بھیجا۔ کتنی بڑی بات ہے۔ ایک معمولی ڈاکیے کے بچے کا اتنا خیال۔ یقیناً ان کے دل میں خوف خدا ہوگا۔ دنیا ایسے ہی نیک لوگوں پر قائم ہے۔

تو بس میں انھیں ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہا۔ لکھنے کا دل ہی نہ چاہا۔ ویسے بھی میں کوئی ڈائری تو لکھ نہیں رہا ہوں۔ یہ تو بڑے لوگوں کے کام ہیں۔ میں بس ایک جعلی قسم کی قصہ گوئی کر رہا ہوں جس کا چسکا مجھے ان غپ مارنے والوں نے لگا دیا ہے۔ جعلی میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر قصہ زبانی نہ سنایا جائے تو وہ قصہ ہی کیا۔ اور اسے لکھا جائے تو وہ صرف دل کی ایک بھڑاس ہوتا ہے۔ اس میں دوسرے کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟ کیا میرے اندر بھی ایسی ہی

کوئی بھڑاس ہے جسے میں دل سے باہر نکال کر پھینکنا چاہتا ہوں؟ اگر یہ بات ہے تو بہت غلط ہے۔ کچھ کچھ ایسے جیسے کیلے کے چھلکوں کو گھر سے باہر سڑک پر پھینک دینا، دوسروں کو پھسلتے رہنے کے سامان فراہم کرنے کے برابر۔

چھوٹے کے پاس وہ جو انگریزی کی کتاب ہے، اس میں بہت سے موضوعات پر مضامین لکھنے کے اصول بتائے گئے ہیں اور ساتھ میں نمونے کے طور پر کچھ مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں مثلاً تاج محل پر، گائے پر اور پوسٹ مین پر۔

اب تو پاگل کورٹ ہی لگ گئی ہے کہ وہ پوسٹ مین پر ایک ایسا طویل اور زبردست مضمون لکھے گا جو دنیا میں آج تک کسی نے نہ لکھا ہو۔ اب میں اسے لاکھ سمجھاتا ہوں کہ تمھاری جماعت کے بچوں کو زیادہ سے زیادہ دو سو الفاظ کا مضمون لکھنا ہوتا ہے، ورنہ نمبر کاٹ لیے جاتے ہیں۔ مگر وہ مانے تب نہ۔ اس نے تو ضد پکڑ لی ہے۔ ڈاکیوں کے بارے میں ایک سے ایک معلومات اس نے نہ جانے کہاں سے حاصل کر لی ہیں۔ شاید وہ یہ مضمون لکھ کر ڈاکٹر صاحب کی بیٹی کو بھی دکھائے گا۔ کل رات میں نے اس کا پوسٹ مین پر لکھا ہوا مضمون پڑھا ہے جو ابھی ادھورا ہے۔ مضمون ابھی میرے سامنے ہی ہے۔ کیوں نہ اس کا ایک آدھ اقتباس میں یہاں نقل کر دوں۔

خطوں کے ساتھ اگر ڈاکیے کی یاد نہ آئے تو وہ خط ہی کیا۔ ڈاکیے کی پہنچ جس طرح دنیا کے عام سے عام آدمی تک ہے، ایسی کسی اور سرکاری نوکری کی کہاں۔ لوگ چاہے شہروں میں رہتے ہوں یا قصبوں میں یا پھر گاؤں اور دور دراز کے جنگل کے علاقوں میں، وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔ ایک فرشتے کی طرح۔ اس کے پاس عام آدمی کی پیاری سواری یعنی سائیکل ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ پیدل بھی چلتا تھا۔ کبھی گھوڑوں پر بھی قاصد بجلی کی رفتار سے دوڑتے

تھے اور اپنے اپنے علاقے کی سرحد تک پہنچ کر وہ دوسرے گھڑسوار قاصد کو خط سونپ دیا کرتے تھے۔ دنیا میں امن کے کتنے مجاہد ان قاصدوں کی رفتار کے مرہون منت رہے ہیں۔ کچھ مقاموں پر کبوتروں نے بھی ڈاکیے کا کام انجام دیا ہے۔ اس لیے کبوتر کو فرشتہ نما اور پاکیزہ جانور مانا جاتا ہے۔ ڈاکیے کا سماج کے ہر طبقے میں استقبال ہے۔ تیوہاروں کے موقع پر ہمیشہ اسے کچھ نہ کچھ بخشش دی جاتی ہے۔ ڈاکیہ سرکار کا پرزہ نہیں بلکہ سماج کا ایک حصہ ہے۔ وہ جب کسی کے گھر تار لے کر جاتا تھا تو تھوڑی دیر وہیں ٹھہر جاتا تھا، انسان کے سکھ یا دکھ میں ایمان داری کے ساتھ شریک ہونے کے لیے۔ آج بھی بہت سے ڈاکیے اجنبی انسانوں کے سکھ دکھ میں اسی طرح شریک ہیں۔ میرے بابو بھی ایک ایسے ہی ڈاکیے ہیں — ایک عظیم ڈاکیے۔

بہت کم لوگوں نے غور کیا ہوگا کہ اس کی وردی کا رنگ پولیس والوں کی وردی سے ملتا جلتا ہے۔ مگر پولیس والوں کی وردی نے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے سوا اب تک کیا کیا ہے؟ اور ڈاکیے کی وردی دیکھ کر لوگوں کے دل اپنائیت اور انسیت کی خوشبو سے بھر جاتے ہیں۔ گرمیوں کی سخت اور سنسان دوپہر میں، جب آسمان میں چیل انڈا چھوڑ رہی ہوتی ہے، اس کی خاکی وردی کی ایک جھلک دور سے نظر آنے پر ہی وہ ویران دوپہر رونق افزا ہو جاتی ہے اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں امیدوں کے گلزار سجنے لگتے ہیں۔ کسی کو خط لکھنا اور کسی سے خط پانا بہت بڑی نعمت ہیں۔ میرے بابو یہی کہتے ہیں۔ میں نے پڑھا ہے کہ گاندھی جی خطوں کا جواب فوراً ہی لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ ان کے پاس روزانہ ڈھیر سارے خطوط آتے تھے۔ خط کا جواب لکھتے لکھتے جب ان کا دایاں ہاتھ تھک جاتا تھا تب وہ بائیں ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کتنے اچھے تھے گاندھی جی۔ اتنے نیک اور عظیم انسان کو بھی کسی نے قتل

کر دیا...... آخر کیوں؟

خطوں کے حوالے سے پوسٹ کارڈ کی بات کرنا بھی ضروری ہے۔ سرکار ہر شے کو مہنگا کر سکتی ہے مگر پوسٹ کارڈ کے دام بڑھاتے ہوئے ڈرتی ہے۔ ایک وہی تو عوام کی سب سے پیاری چیز ہے۔ روٹی اور دودھ اور دال اور چاول سے بھی پیاری چیز جو حقیر سے حقیر انسان کے وجود کو بھی بامعنی اور باوقار بنا دیتی ہے۔ ابھی حال میں اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ امریکہ میں ایک الیکٹرانک میوزک بینڈ کی ایجاد ہوئی ہے جس کا نام پوسٹل سروس رکھا گیا ہے۔ یہ نام اس لیے ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے جانے کن کن ملکوں سے آپس میں پوسٹ کارڈ لکھ لکھ کر آلات موسیقی کے بارے میں اپنے اپنے تجربات بیان کیے جن کو جمع کر کے یہ عظیم الشان بینڈ بنایا گیا۔

ڈاکیے کا نہ کوئی مذہب ہے نہ ذات اور نہ ہی کوئی طبقہ بلکہ وہ سماج کی مختلف اکائیوں اور طبقوں کو آپس میں ملانے اور پرونے کا کام انجام دیتا ہے۔

ہماری فلموں میں بھی اکثر ڈاکیے کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ میں نے تو ابھی تک کوئی فلم نہیں دیکھی ہے مگر بابو نے وعدہ کیا ہے کہ جب بھی کبھی ان کی جوانی کے دنوں کی مشہور فلم ''ڈاک ہرکارہ'' دوبارہ نمائش کے لیے پیش کی جائے گی تو وہ مجھے دکھانے کے لیے ضرور لے جائیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ڈاکیہ فلموں کا نہیں بلکہ اصلی زندگی کا ہیرو ہے...... میرے بابو کی طرح۔ جب وہ اپنی خاکی رنگ کی وردی پہن کر، ٹوپی لگا کر، ڈاک گھر جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو اس طرح جگمگانے لگتے ہیں جس طرح مٹی میں ہیرا۔

اور اب آخر میں یہ بتانا بھی چاہتا ہوں کہ شروعات کے دنوں میں صرف خط یا چٹھی تقسیم کرنا ہی ڈاک والوں کا کام نہ تھا بلکہ وہ سرایوں کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ وہ سڑک پر دن

رات چلنے والے مسافروں کے سفر کو آسان اور سہولت سے بھرا ہوا بنا دیتے تھے۔ انھیں ٹھگوں اور راہزنوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ یہی سرائے بعد میں آگے چل کر ڈاک بنگلوں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ رات کو مسافر راستے میں پڑنے والی ڈاک چوکیوں میں بھی آرام کر سکتے تھے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ کہ کچھ عرصے تک گاؤں اور دور دراز کے علاقوں میں ڈاکیوں نے پلیگ کی دوائیں مریضوں تک پہنچانے کا فریضہ بھی انجام دیا۔

اب بھلا بتائیے کیا یہ بارہ تیرہ سال کے بچے کی تحریر معلوم ہوتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ مضمون میں بڑی بے ربطی ہے۔ جگہ جگہ کچا پن بھی ہے مگر وہ تو فطری ہی ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس نے اتنی ساری معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں اور بھلا ان تمام معلومات کا فائدہ؟ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب اس کے ذہن کا تخیل ہو۔ اس میں سے کسی بھی بات میں کوئی صداقت نہ ہو۔ مگر اگر ایسا ہے تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ آخر اس کے ننھے سے ذہن پر ڈاکیے اور ڈاک گھر اتنا حاوی کیوں ہیں؟ کیا اس کی وجہ میں ہوں؟ لیکن اب ایمان اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ میں ایک حقیر سا ڈاکیہ۔ یہ بھی کوئی رتبہ ہوا؟ اگر میں ڈاکٹر یا وکیل یا کوئی نیتا وغیرہ ہوتا تو بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ ان لوگوں کے بچے اپنے ماں باپ کی نقل اتارا ہی کرتے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر، بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ میں خواب میں بھی ہر گز نہ چاہوں گا کہ میری اولاد بھی ڈاکیہ بنے، بھلے ہی مجھے اپنی چٹھیاں بانٹنے کے لیے نکلنا کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگتا ہو۔ امتحان میں ڈاکیے پر ہزار پانچ سو لفظوں میں مضمون لکھ دینا الگ بات ہے اور ڈاکیہ بننا ایک قطعاً مختلف اور دوسری بات۔ دنیا ایسی ہی منافقتوں کی وجہ سے تو اتنی خوب صورت

نظر آتی ہے۔

کچھ عرصے سے میں یہ واضح طور پر محسوس کرنے لگا ہوں کہ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ اس میں سے شرافت غائب ہوتی جارہی ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا انسان ہوں مگر یہ پیشن گوئی کرسکتا ہوں کہ آگے آنے والا زمانہ بہت ہی خراب ہوگا۔ میرا بڑا لڑکا بھی غلط صحبت میں پڑتا نظر آرہا ہے۔ اسے پڑھنے لکھنے میں تو کیا، قاعدے کے کھیل کود میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری ڈانٹ پھٹکار کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ وہ اتنا بے غیرت ہو چکا ہے کہ میں نے اسے اب زیادہ کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا ہے۔ محلے میں غنڈہ گردی بڑھتی جارہی ہے۔ گلیوں میں لفنگوں اور شہدوں کے جتھے ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ بے روزگاری بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہوسکتی ہے۔ اس ماحول کی وجہ سے ہی شاید سامنے والے ڈاکٹر صاحب یہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور جا بسے ہیں، یا شاید ان کا کہیں تبادلہ ہوگیا ہے۔ وہ لوگ اتنی خاموشی سے مکان خالی کر گئے کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ اچھا ہی ہوا۔ ویسے بھی یہ بڑا منحوس علاقہ ہے۔ جب دیکھو تب یہاں طاعون ہی پھیلتا رہتا ہے۔ مگر ان کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ چھوٹا کچھ گم سم سا رہنے لگا ہے۔

کل یہاں ایک بہت ہی تکلیف دہ اور شرمناک واقعہ ہوا۔ قلعے کی کالی ندی کے پل کو پار کرتے ہی بائیں طرف سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی ہری مسجد ہے۔ وہاں کوئی پردیسی آکر ظہر کی نماز پڑھنے لگا۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ دوسرے مسلک کا ہے۔ بس پھر کیا تھا، نمازیوں نے اپنی نیت توڑ کر اس پر حملہ کردیا جیسے وہ کوئی موذی سانپ تھا یا اس سے بھی بدتر۔ انھوں نے مسجد سے اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ محلے کے کچھ نوجوان غنڈے اس کی طرف چاقو نکال کر بھی دوڑے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اسے لگا نہیں۔ کسی طرح اپنی جان بچا کر

بھاگا۔ اس کے بعد مسجد کا فرش، دیواریں اور یہاں تک مینار بھی دھو کر "پاک" کیے گئے۔ امام صاحب کا کہنا تھا کہ غیر مسلک کا آدمی وہاں نماز ادا کرے تو اللہ کا گھر ناپاک ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں، میں دین و مذہب کی اتنی باریک باتیں نہیں جانتا۔ مگر میں ایک بات سے اور فکر مند ہوں اور وہ یہ کہ مجھے شبہ ہے کہ بڑا بھی ان لونڈوں میں شامل تھا جو اس بے چارے کے اوپر چاقو تانتے ہوئے دوڑے تھے۔ اس واقعے سے آج کل ماحول میں تناؤ سا ہے۔ کل کوئی کہہ رہا تھا کہ آس پاس کے لڑکے زیادہ تر اپنے پاس چاقو اور دیسی طمنچہ رکھنے لگے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اپنی حفاظت کرنا سمجھ داری کی بات ہے، کیوں کہ پورب کی سمت سے، جہاں نچلے طبقے کے ہندوؤں کی بستی ہے، کبھی بھی مسلمانوں پر دھاوا بولا جاسکتا ہے۔

مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ آج کل ڈاک بانٹنے کے کام میں میری طبیعت لگتی نہیں۔ مسجد والے واقعے کے بعد سے میرا دل برا ہو گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ جو اتنے سارے خطوط اور پیغامات وغیرہ میں ایک انسان سے دوسرے انسان تک پہنچا تا رہتا ہوں، آخر ان میں ہوتا کیا ہے؟ یہ محبت نامے ہیں یا طاعون کے جراثیم؟ کیا انسان دوسرے سے اسی طرح مخاطب ہوتا ہے یا پھر یہ سارے لوگ ایک بھیانک نیند کے شکار تو نہیں ہو گئے ہیں؟ کسی ہدایت، کسی تلقین، کسی پیغام، محبت اور خوشی کی ان تک واقعتاً کوئی رسائی ہی نہیں ہے۔ وہ اس سیاہ نیند میں صرف نفرت اور تشدد کے خواب دیکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ایسی نیند کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ یہ کام صور اسرافیل کے علاوہ اور کسی کے بس میں نہیں۔

ایک عرصہ ہوا جب مجھے لکھنے کا یہ شوق چرایا تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ ذاتی باتیں لکھوں۔ مگر اب جو اپنا لکھا ہوا پڑھتا ہوں تو یہ سب مجھے اپنی نجی ڈائری کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر کل کلاں کسی کو میرا یہ پلندہ مل جائے تو اس بکواس کو وہ ایک ڈاکیے کی ڈائری ہی سمجھے گا، کوئی قصہ

کہانی تو ہر گز نہیں۔ لہٰذا اب جا کر اس افسوسناک امر کا احساس مجھے ہوا ہے کہ جس طرح کسی جانور کی کھال اتارتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ اس سے لگا لپٹا خون نہ باہر آئے، بالکل اسی طرح دنیا کے بارے میں کوئی بھی بات لکھتے وقت انسان کی ذات کے لہو کی بو لفظوں سے ہمیشہ لپٹی رہتی ہے۔

اس لیے مایوس ہو کر میں یہ بیکار کا مشغلہ اب ترک کر رہا ہوں۔ بس اتنے ہی میں میرا شوق پورا ہو گیا، یا یہ کہیے کہ اب میرا دل بھر گیا۔ میں اس کے آگے کچھ بھی لکھنے سے بھر پایا۔

اس کے بجائے میں نے سوچا ہے کہ مجھے اپنی توجہ اس بوسیدہ سائیکل کو دینا چاہیے جس کی مرمت ایک عرصے سے ٹل رہی ہے۔ اس کے دونوں پہیوں میں لہر آ گئی ہے اور مڈگارڈ کھڑکھڑ بولتا رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مجھے چھوٹے کے ساتھ اب زیادہ وقت گزارنا چاہیے۔ آج کل رات کو سوتے وقت وہ بڑے بھاری بھاری خراٹے لینے لگا ہے۔ اور اس کا سر تو اب بالکل ایک طاعون زدہ چوہے کے سر جیسا ہی ہوتا جا رہا ہے۔

(۲)

خون سے خالی سفید گول چہرہ

''تم پھر یہاں آ گئے؟'' بڑے بھائی نے لیمپ بناتے بناتے اسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ جواب میں کچھ نہ بولا۔ بس سامنے پڑی لکڑی کی کالی اور گندی میز پر ٹین کے ایک بڑ

رنگ ڈبے میں رکھی ہوئی سفید گاڑھی لیہی کو اور کالی کالی مہروں کو چمکتی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔اس لیہی سے لفافے بند کیے جائیں گے۔ڈاک ٹکٹ چپکائے جائیں گے اور پھر یہ کالی مہریں ان پر ثبت کر دی جائیں گی۔

یہ ایک چھوٹا سا ڈاک گھر تھا۔انگریزوں کے زمانے کی گوتھک طرز کی ایک گول اور منحوس پرانی عمارت۔عام طور سے یہ گول ڈاک خانہ کے نام سے مشہور تھا۔اس کا بھائی اس گول ڈاک خانے میں لیہی اور گوند بنانے کا کام کرتا تھا۔

"تم بھاگ جاؤ یہاں سے۔میرا مذاق نہ بنوایا کرو۔" بڑے بھائی نے لیہی سے سنی انگلیاں ایک کپڑے سے صاف کیں۔

"میں وہ سرنگیں دیکھنے آیا ہوں۔" وہ سر جھکائے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"کون سی سرنگیں؟"

"بابو نے بتایا تھا کہ اس ڈاک خانے کے نیچے کچھ سرنگیں ہیں جو بہت دور دور کے شہروں کے ڈاک خانوں میں جا کر کھلتی ہیں۔"

"ہاں۔سنا میں نے بھی ہے مگر ان تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔وہ فوجی تحویل میں ہیں اور ان میں اسلحہ بھرا ہوا ہے۔"

وہ مایوس ہو گیا۔

"اچھا تو پھر میں چلتا ہوں۔" اس نے اپنی وردی کی شکنیں درست کیں۔سر پر لگی ہوئی ٹوپی کو سیدھا کیا اور اپنا تھیلا سنبھالتے ہوئے تقریباً دوڑتا ہوا وہاں سے واپس جانے لگا۔

"سیدھے گھر جانا۔" بڑے بھائی نے آواز لگائی۔" آج سورج گرہن پڑے گا۔"

اس نے اپنے چوہے جیسا سر ہلایا۔

اس کا سر تو ضرور ایک طاعون زدہ چوہے کی طرح بے بس اور مغموم نظر آتا تھا مگر جسم مضبوط اور قد بہت لمبا تھا۔ اس کے حلیے کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ بھی گمان گزرتا تھا جیسے کسی تندرست و توانا آدمی نے کسی تماشے کے لیے چوہے کا نقاب پہن رکھا ہے۔ یہ ایسا سر تھا جسے دیکھ کر یہ اندیشہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید ابھی ابھی اس کے منھ سے خون کی پتلی لکیر پھوٹنے لگے اور ننھے ننھے دانت اس طرح باہر نکل آئیں جس طرح طاعون میں دم توڑتے ہوئے چوہے کے۔

مگر اس کے دانت بھی ننھے ننھے نہیں تھے۔ وہ عام دانتوں کے مقابلے کچھ زیادہ ہی بڑے اور چوڑے تھے۔ جب وہ ہنستا تھا (ایسا کم ہی ہوتا تھا) تو دیکھنے والوں کو لگتا کہ جیسے یہ دانت منھ سے باہر نکل کر خود اس کی ہنسی کو ہی چبا چبا کر نیست نابود کر رہے ہوں۔

گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ جون کا مہینہ تھا۔ جون کی گرمی اور تپش کی انفرادیت ہی یہ ہے کہ وہ بار بار آدمی کے دل کو ایک گیلے تولیے کی طرح نچوڑتی رہتی ہے۔

تیز تیز چلتا ہوا وہ گول ڈاک خانے سے بہت دور نکل آیا تھا۔ سڑک کے چاروں طرف جنگلی جھاڑیاں اُگ رہی تھیں۔ بس تھوڑا آگے چل کر بائیں طرف مڑنے پر کالی ندی کا وہ بوسیدہ پُل پڑتا تھا جس کے تین در تھے۔ برسات کے دنوں کو چھوڑ کر صرف ایک در میں ہی پانی بہتا تھا۔ ویسے کالی ندی کا کیا تھا، وہ تو یہاں بھی بہہ رہی تھی۔ ادھر جھاڑیوں کے پیچھے خاموشی کے ساتھ۔

کچھ دور نکل آنے پر اسے ندی کا پُل نظر آنے لگا۔ وہ چونک پڑا، مگر اس بار خوف زدہ نہیں ہوا۔ آج وہ اسے تیسری بار نظر آئے تھے۔ وہ پُل پر سے جا رہے تھے۔ قطار بنا کر، پیروں میں لمبی لمبی لکڑیاں لگائے ہوئے۔

اسے یاد تھا۔ پہلی بار جب انھیں دیکھا تھا، زمانہ گزر گیا۔

خوف زدہ ہو کر اس نے بابو کا ہاتھ سختی سے بھینچ لیا تھا۔

''بابو یہ کیا ہے؟''

''ارے یہ؟ یہ تو 'پاسنگ شو' سگریٹ کا اشتہار ہے۔ یہ ایک کرتب ہے۔ نٹوں کا کرتب۔ یہ اپنے پیروں میں بانس لگا کر چل لیتے ہیں۔ مگر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

وہ اسی طرح بابو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے کھڑا رہا۔

وہ سب سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ اتنے طویل قامت کہ ان کے سروں کی، جوکروں جیسی سفید ٹوپیاں پُل کے کنارے لگے بجلی کے کھمبوں کے تاروں کو چھو رہی تھیں۔ وہ گھروں کی دیواروں سے بھی اونچے تھے۔ یہ ایک بھیانک منظر تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں دبی ہوئی میٹھے چورن کی پڑیا چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ کہیں بہت دور سے، سردی میں بھی نہ جانے کہاں سے بھٹکتا ہوا پسینہ آگیا۔

اور دوسری بار اس نے انھیں جب دیکھا تو اس کے بابو کا جنازہ جا رہا تھا۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ ساتھ تھا۔ جب میت ندی کے پُل پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ سامنے سے وہ آ رہے تھے۔ سفید کپڑے، پیروں میں وہی لمبے لمبے بانس لگائے۔ ایک خاموش جلوس کی شکل میں چلتے ہوئے وہ خود بھی ایک جنازے ہی کی مانند نظر آئے۔

بابو کی میت جب ان کے قریب پہنچی تو وہ سب رک گئے۔ اسے اس وقت احساس ہوا کہ چار اشخاص کے کاندھوں پر اٹھا کر لے جائے جانے والا میت کا پلنگ ان درجنوں کی تعداد میں، پیروں میں بانس لگا کر چلنے والے مہیب طویل قامت لوگوں سے اتنا نیچا ہو گیا تھا کہ نظر ہی نہ آتا تھا۔

''کیا تم ڈر رہے ہو؟ یہ ایک کرتب ہے۔ کرتب تب ہی دکھائے جاتے ہیں جب لفظ مر

جاتے ہیں اور دنیا کو نیند آنے لگتی ہے۔" مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ پُل کے نیچے بہتی کالی ندی میں شام گر رہی تھی۔ بابو کے جنازے اور ان ہولناک اشخاص کے عکس کالی ندی میں ٹوٹ ٹوٹ کر بہنے لگے۔

وہ نہ جانے کب سے یہیں کھڑا تھا۔ وہ تو پُل پر سے نہ جانے کب کے غائب ہو چکے تھے۔ وہاں اب ہر طرف سناٹا تھا۔ بچپن میں وہ بار بار اس پُل پر سے گزرتا تھا۔ ویران ساختہ حال پُل۔ دونوں طرف زنگ لگی ہوئی کمزور سی ریلنگ۔ وہ اس کے گزرنے سے ہلتا تھا۔

وہ دن وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ پُل پر بادلوں کے سائے تھے اور گزری ہوئی بارشوں کے چھینٹے تھے۔ ریلنگ پر دونوں طرف سے سفید رنگ کا مانجھا تنا ہوا تھا۔

سڑک نہ جانے کب ہوئی بارش سے بھیگی پڑی تھی۔ اسی بھیگی سڑک پر اس کا پیر پھسل گیا۔ اس کی گردن تنے ہوئے مانجھے کے درمیان پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ وہ مانجھا نہیں تھا۔ ایک چاقو تھا۔ ایک تیز دھار والا بے رحم ہنسی ہنستا ہوا چاقو۔

گردن سے بہتی خون کی دھار کو اپنے دونوں ہاتھوں سے روکتے ہوئے وہ دوڑنے لگا، بارش سے بھیگے ہوئے اسی ہلتے پُل کے نیچے بہتی ہوئی کالی ندی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ ندی کو اور نہ دیکھ پایا اور ایک جگہ بیٹھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے وہ کھڑی تھی۔ ایک لڑکی جو عمر میں اس سے دو تین سال بڑی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل گول اور بے حد سفید تھا۔ اتنا سفید کہ اسے شائبہ گزرا کہ شاید اس میں خون ہی نہیں ہے۔ لڑکی کی دو گھورتی ہوئی آنکھیں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کیوں وہ اس کے چہرے سے لاکھ کوشش کرنے پر بھی نظریں نہ اٹھا سکا۔

ڈاکٹر صاحب نے ٹانکے لگانے اور پٹی باندھنے کی کوئی فیس نہیں لی۔ بُوا نے اس کا ہاتھ

تھاما اور ان لوگوں کو دعائیں دیتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل دیں۔

آہستہ آہستہ اس کا زخم بھرنے لگا۔ مگر اسے ہلکا ہلکا سا بخار ہو جاتا تھا۔ آواز میں بھی تھوڑی سی تبدیلی آگئی تھی۔ دراصل زخم تو بھر رہا تھا مگر ٹانکوں میں کہیں کہیں مواد پڑ گیا تھا۔ مواد ہمیشہ آنے والے کھرنڈ کا راستہ روک لیتا ہے۔

ان دنوں وہ اپنے پلنگ پر لیٹا لیٹا صرف گول ڈاک خانوں اور گول سفید چہروں کا ہی آپس میں موازنہ کرتا رہتا تھا۔

پھر ایک دن وہ آئی، اس کا حال دریافت کرنے۔ اس کے ہاتھ میں انگریزی کی ایک کتاب تھی۔

''یہ امی نے تمہیں دی ہے۔ اسے پڑھنا۔ دل بہلے گا۔'' لڑکی نے کہا۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے یہ آواز بھی اس کے چہرے ہی کی طرح سفید اور خون سے خالی تھی۔

لڑکی نے تھوڑی دیر بُوا سے کچھ رسمی باتیں کیں پھر یہ کہہ کر کہ وہ کل آئے گی، رخصت ہو گئی۔ مگر دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک بار مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ دیکھا تھا یا گھورا تھا، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔

تب تو نہیں مگر اب وہ واضح طور پر سب جانتا ہے کہ دراصل اس کی آنکھیں ہی ایسی تھیں۔ وہ گھورتی رہتی تھیں۔ وہ کسی شکرے کی آنکھیں تھیں۔ گھورنے سے ہی ان آنکھوں میں قوت اور بصارت، کا نور پیدا ہو سکتا تھا۔ ورنہ وہ صرف اندھے کی آنکھیں تھیں۔ مگر بچپن میں وہ یہ سب کہاں جانتا تھا۔ ان دنوں تو اسے ان گھورتی ہوئی آنکھوں اور خون سے خالی سفید گول چہرے سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ تقریباً روز ہی اس کے گھر آتی تھی مگر باتیں صرف بُوا سے کرتی تھی۔ اسے تو صرف گھورتی رہتی تھی۔

وہ اب ٹھیک ہوگیا تھا، اسے بخار بھی نہیں آتا تھا۔ مگر جب وہ اس سفید چہرے کی جانب نظر اٹھاتا تو اسے اپنی ہڈیوں کے اندر پوشیدہ ایک تازہ بخار کا احساس ضرور ہوتا۔ عجیب بات تھی کہ اسے صرف اس کا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ کوشش کرنے پر بھی وہاں اور کچھ نہیں دیکھا یا محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ بہت ڈھیلے ڈھالے اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کپڑے پہنتی تھی۔ اس کے پیٹ کی طرف دیکھنے پر لگتا جیسے وہ آنتوں سے خالی پیٹ ہو۔ جیسے وہاں صرف ہوا بھری ہو۔ وہ کبھی کبھی اس کی کہنیوں کی ہڈیوں یا کلائی کی ہڈیوں کو دیکھنا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا۔

وہ گول سفید چہرہ بھی دراصل ایک خالی طشتری ہی کی طرح تھا جس پر اس کی بے حس، گھورتی ہوئی دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی ڈیزائن کی مانند چھپاں تھیں۔ یقیناً وہاں ناک تھی، ہونٹ تھے، ٹھوڑی تھی اور کان بھی تھے مگر وہ یاد نہ آتے تھے۔ اور اکثر وہ چہرہ انھیں اپنی حبس بھری سفید گول دھند میں چھپا لیتا تھا۔

''شاید وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، اس لیے گھورتی ہے۔'' وہ اکثر سوچتا۔ دراصل گھورنا ایک پراسرار عمل ہے۔ محبت میں، نفرت میں، غصے میں، غور و فکر میں اور یہاں تک کہ بے خیالی میں بھی آنکھوں کو بہر حال گھورنے کا فرض تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ تو پھوٹ پھوٹ کر رونے کا وقت ہی ہے جب آنکھوں کو گھورنے سے نجات ملتی ہے۔

اس لیے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتا مگر ایک دن آخر اس نے ارادہ کر ہی لیا۔ بڑی ہمت کر کے اس نے ایک سفید کاغذ پر لکھا۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔''

پھر اس جملے کو انگریزی میں بھی لکھا، کیوں کہ اسے یاد آیا کہ وہ انگریزی اسکول میں

پڑھتی ہے۔

"I love you"

عبارت کے نیچے اس نے بچکانہ انداز میں ایک پھول بھی بنا دیا تھا۔ یہ اس کا محبت نامہ تھا۔ زندگی کا پہلا اور آخری محبت نامہ جسے اس نے لڑکی کو دی ہوئی انگریزی کتاب میں احتیاط کے ساتھ رکھ دیا۔

اس دن صبح سے دو پہر تک بارش ہی ہوتی رہی۔ جب بارش تھمی تو وہ آئی۔ اس کے آنے پر وہ کتاب ہاتھ میں تھام کر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اگست کا مہینہ تھا۔ بارش کے بعد دھوپ نکل آئی تھی۔ محلے کے گھروں کی دیواریں اور منڈیریں صبح کی بارش سے بھیگی ہوئی تھیں مگر اب ان پر سنہری دھوپ چمکنے لگی تھی۔

کچھ دیر بُوا سے باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے گھر واپس آنے کے لیے نکلی۔ اس نے اسے دروازے پر کھڑے دیکھا تو چونک گئی۔

"لو اپنی کتاب۔" اس نے اسی گھر گھراتی ہوئی آواز میں کہا جو گردن کے زخم کے بعد اس کے حلق سے نکلنے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ آواز خود ایک کٹا پھٹا زخم تھا جس میں پیپ بھر گئی ہو۔ ایک پل کے لیے اس نے خود کو دروازے پر کھڑا ایک ڈاکیہ تصور کیا۔

"اس میں ایک خط ہے۔" اس نے اپنی پیپ بھری آواز میں اس طرح کہا جیسے ڈاکیے دروازے پر آواز لگاتے ہیں۔

لڑکی نے کتاب تھامی، پھر اس کے اندر سے وہ سفید کاغذ نکالا۔ اس کا سفید گول چہرہ اور بھی زیادہ خطرناک حد تک سفید ہو گیا۔ اس کی گھورتی ہوئی دو آنکھیں اس کے چہرے سے نکل کر اڑنے لگیں، کسی شکاری عقاب کی طرح۔

"میں تمھارے چوہے جیسے نفرت آمیز سر کو دیکھتی تھی۔ میں تم سے نفرت......۔" لڑکی کی خون سے خالی آواز دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائی۔ اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا پرزہ پرزہ کر کے اس کے منھ پر دے مارا۔ پھر اس کے جسم پر کپڑے اور بھی زیادہ بڑھ گئے۔ اتنے زیادہ کہ اس کے بعد وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکا۔

ٹھیک اس وقت آسمان پر کہیں رینگتا ہوا گھنا سیاہ بادل آپہنچا اور دیواروں، منڈیروں سے چپکی ہوئی دھوپ اچانک ایک حواس باختہ یا مردہ چھپکلی کی طرح نیچے گر گئی اور سڑک کنارے، کالا پانی لے جاتی ہوئی تنگ نالی میں کسی زرد سانپ کی طرح بل کھاتی، بہتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ سفید چہرہ اس کا اکلوتا اندھیرا بن گیا۔ اس اندھیرے میں ایک تیز دھار والا نفرت آگیں چاقو پھر اس کی گردن پر آکر ٹھہر گیا۔

وہ پُل اب بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ چلتے چلتے وہ وہاں سے دور نکل آیا ہے۔ اب وہ بچہ یا کم سن لڑکا نہیں ہے۔ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی ہے۔ مگر اب بھی اس کے خوابوں میں سبز رنگ کا ایک بڑا سا ڈاک ٹکٹ اڑتا ہوا آتا ہے جس پر وہ گول اور سفید چہرہ بنا ہوا ہے۔ ان خوابوں میں، جنھیں دیکھ کر سوتے وقت وہ زور زور سے خراٹے لیتا ہے اور کبھی کبھی اس کی بیوی بے رحمی کے ساتھ زور زور سے اس کا شانہ جھنجھوڑ کر جگا دیتی ہے۔

چلتے چلتے اسے محسوس ہوا کہ تھیلے میں سے کاغذ ڈھیلے ہو کر باہر آرہے تھے۔ تھیلے کا توازن بگڑنے لگا۔ وہ سڑک پر اکڑوں بیٹھ گیا اور تھیلے کے کاغذوں کو ایک ڈوری سے کس کر

باندھنے لگا۔

اور تب اس نے سوچا کہ محبت اور نفرت دونوں اپنی الگ الگ تاریخ لکھتی ہیں۔ دو متوازی تاریخیں اور پھر آخر میں یہ دونوں ایک ہی ڈور سے بندھ جاتی ہیں۔ کبھی نہ سمجھ میں آنے کے لیے، ایک راز، ایک معمہ بن جاتی ہیں۔

اس نے اپنی گردن کو چھوا۔ زخم جب بھر جاتے ہیں تو ان کے اندر رہنے والا درد کہاں جاتا ہے۔ کس اندھیرے گوشے میں جا کر چھپ جاتا ہے؟ کیوں کہ اس ناقابل معافی دنیا میں کوئی بھی شے، کوئی بھی کیفیت کبھی مٹتی نہیں۔ وہ صرف اپنا چولا بدل لیتی ہے۔

وہ دوڑ دوڑ کر چل رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ چوبیس سال بعد آج پھر سورج گرہن پڑنے والا ہے۔ مگر دھوپ میں ایک دوسرے قسم کی تیزی ہے۔ ایک شدید احتجاج، ایک تپتا ہوا غصہ چاند کے خلاف۔ زمین کے خلاف۔ آسمان کے پردے سے باہر آرہا تھا۔ دور کسی پنجرے میں بند درندے کی غراہٹ کی طرح۔ اس نے اسے واضح طور پر سنا۔

(۳)

قتل کا حلیہ کیسا ہے؟

”بھیا۔ ڈبے میں کریلے اور روٹیاں رکھ دی ہیں۔ مگر ہو سکے تو آج دوپہر سے پہلے ہی گھر آجانا۔ آج سورج گرہن ہے۔“ بہن نے بھائی سے کہا تھا۔

”اب جتنی ڈاک ہوگی وہ تو بانٹنا ہی پڑے گی مگر تم دونوں بچوں کو دوپہر میں گھر سے باہر مت نکلنے دینا۔“ بھائی نے چائے پیتے پیتے جواب دیا تھا۔

"بابو سورج گرہن میں کیا ہوتا ہے؟" چھوٹے نے باپ کی وردی پر رینگتی ہوئی چیونٹی کو جھاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"چاند زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے اور سورج کی روشنی کم ہو جاتی ہے۔"

"بابو میں بھی چلوں تمھارے ساتھ، سورج گرہن دیکھنے؟"

"میں سورج گرہن دیکھنے تھوڑی جارہا ہوں۔ میں تو اپنی ڈیوٹی پہ جارہا ہوں۔ مگر تم دوپہر میں گھر سے مت نکلنا۔ اس کے اثرات خراب ہوتے ہیں۔"

وہ اپنی چائے ختم کر کے اٹھ گیا۔ اپنی وردی اور ٹوپی کو سنبھالتے ہوئے اس نے دروازے میں کھڑی سائیکل اٹھائی جس کے کیریئر میں چھوٹا سا المونیم کا ناشتہ دان لگا ہوا تھا۔

بابو آج ہیرو نظر آرہے ہیں، یہ وردی ان پر کتنی سجتی ہے۔ چھوٹے نے سوچا تھا۔

گیارہ بجے سے لگاتار ڈاک بانٹتے بانٹتے وہ تھک گیا تھا۔ اب دوپہر ہو رہی تھی۔ اس کی سائیکل کچھ دنوں سے بہت بھاری چلنے لگتی تھی۔ پیڈل مارنے میں پیروں کی جان ہی نکل جاتی تھی۔ مئی کی دوپہر تھی۔ لُو بہت تیز چل رہی تھی، گرم گرم جھکڑ اس کی وردی کو اڑائے دے رہے تھے اور سائیکل ہوا کے زور سے بار بار پیچھے کی طرف جاتی تھی۔ اسے بہت طاقت لگانا پڑ رہی تھی۔ سڑکیں اور گلیاں آج تقریباً ویران تھیں۔ ایک تو دوپہر کی وجہ سے اور شاید گرہن کے سبب بھی۔

بس یہ دو منی آرڈر اور پہنچا دوں، پھر آرام سے چھاؤں میں بیٹھ کر کہیں کھانا کھاؤں گا۔ اس نے سوچا۔ بھوک اور پیاس سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

اب وہ دادو کے کنوئیں کے قریب آگیا تھا جس کے پاس پاکھڑ کا ایک پرانا درخت تھا۔ اسے دادو کے کنوئیں کے سامنے والی گلی میں جانا تھا جو آگے چل کر بند تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ یہی وقت سورج گرہن کا ہے۔

دھوپ مٹیالی ہوگئی تھی۔ دھوپ کا یہ مٹیالا پن خوش گوار نہ تھا۔ سورج کے سامنے بادل کا کوئی چیتھڑا تک نہ تھا مگر کسی پر اسرار سبب سے اس کی چمک کم ہوتی سی محسوس ہوئی۔

ویران دوپہر کے دھندلے آسمان میں کوئی چیل انڈا چھوڑ رہی تھی۔

ماحول میں ایک عجیب سی، ناقابل تشریح قسم کی نحوست طاری ہوگئی۔

وہ سائیکل سے اتر کر، پیدل، سائیکل کا ہینڈل تھامے تھامے اس سنسان بند گلی میں داخل ہوا۔

اس نے دیکھا سامنے تین چار لڑکے کھڑے ایک فحش سا گیت گاتے ہوئے اس کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔

''ہٹ جانا بھائی، آگے جانا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''چپ تیری بہن کی...... نکال کتنے پیسے ہیں تیرے تھیلے میں۔''

''اسے ہاتھ مت لگانا۔ یہ منی آرڈر کے پیسے ہیں۔ میری جیب میں جو ملے، وہ لے لو۔'' وہ سہم کر تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

''تیری تو ماں کی......'' ایک لڑکے نے جیب میں سے لمبا سا چاقو نکالا۔

اس نے ڈاک کے تھیلے کو کس کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

لڑکوں نے مل کر اسے دبوچ لیا اور اس پر پے در پے چاقو کے وار کرنے لگے۔

وہ بڑی ہذیانی چیخیں تھیں مگر اس وقت جیسے انھیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ تھیلا چھین کر وہ چاروں دادو کے کنویں کی طرف بھاگتے چلے گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامے ہوئے چیختا ہوا دادو کے کنویں کی طرف دوڑا مگر پھر اس میں سکت نہ رہی۔ اپنا پیٹ تھامے

تھامے وہ جھکتا چلا گیا۔ پھر بے دم ہو کر زمین پر پڑی ہوئی اپنی سائیکل پر گر پڑا۔

وہ یوں ہی اپنی سائیکل پر گرا ہوا تھا۔ اس کے پیٹ سے آنتیں نکل کر باہر آ گئی تھیں۔ اس کے نیچے زمین پر خون کا دھبہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اسی خون پر اس کا ناشتہ دان کھل کر الٹ گیا تھا جس میں سے کریلوں کی سبزی اور دو روٹیاں نکل کر اس کے پیٹ سے باہر آئی ہوئی بھوکی آنتوں سے جا لپٹی تھیں۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامے دم توڑ رہا تھا۔ آسمان اور بھی مٹیالا ہونے کی طرف جھکا۔ دھوپ بالکل مدھم ہو گئی۔ آسمان کی اونچائیوں میں ایک چیل چیخی اور دادو کے کنویں میں بیٹ کرتی ہوئی گزر گئی۔ دور خلا میں سورج کو گرہن لگا۔ پھر ایک ثانیے بعد دھوپ تیز ہوئی اور تب دادو کے کنویں کی طرف سے ایک شور اٹھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر دوڑتے ہوئے ادھر چلے آ رہے تھے۔

"ارے ڈاکیے کو مار ڈالا۔ بے چارے غریب ڈاکیے کو۔" کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا مگر اس کے کانوں میں یہ آواز بہت مدھم سی سرگوشی بن کر آئی اور شاید یہ اس دنیا کی آخری آواز تھی جو اس کے کانوں نے سنی۔

چھوٹے کو صرف اتنا یاد ہے کہ بھری دوپہر میں سڑک پر خون کا ایک بڑا سا دھبہ تھا جو لو کے گرم تھپیڑوں سے خشک اور سیاہ ہوتا جاتا تھا۔ سائیکل کی گھنٹی، مڈگارڈ، پہیے، تیلیاں، گدی، سب پر خون کے چھینٹے تھے۔ بابو کی خاکی رنگ کی وردی خون میں اس طرح لتھڑی ہوئی تھی جیسے مٹی خون سے لتھڑ جاتی ہے۔ اس کو بابو کی شکل نظر نہیں آئی، یہاں تک کہ اس شام جب اسے باپ کی میت کے پاس لے جایا گیا تو وہاں بھی اسے کوئی شکل نہیں دکھائی دی۔ سفید کفن کے نیچے جھانکتا ہوا صرف وہی خون کا بڑا سا دھبہ ہی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔

بہت عرصہ گزر جانے کے بعد کسی مسخرے نے اس سے پوچھا تھا۔

''قتل کا حلیہ کیسا ہوتا ہے، وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟''

تب چھوٹے نے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا تھا کہ قتل خون کے رنگ کا ڈاک ٹکٹ ہے جس پر ایک چاقو بنا ہوا ہے۔

(۴)

بہروپیا

جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو بیوی باہر ہی کھڑی مل گئی۔

''آگئے؟ آج کتنا کمایا؟'' وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر چہرے سے خوشی کا اظہار کیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے تک آیا، پھر وردی اتار کر دیوار پر لگی کھونٹی پر ٹانگ دی۔ پھر سر سے ٹوپی اتاری اور فرش پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''روٹی کھاؤ گے؟''

اس نے بظاہر خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اچھا ہوا اگر تم اپنی ٹوپی ہر وقت سر پر لگائے رہو، ایک تو بالکل گنجے ہو چکے ہو، اوپر سے ٹوپی اتارنے پر تمھارے سر کا چوہا پن کچھ اور نمایاں ہونے لگتا ہے۔'' بیوی نے کہا۔

اچانک اس کے چہرے کی خوش دلی غائب ہوگئی۔ اس کے اندر سے اداسی اس طرح نمایاں ہوگئی جیسے رنگے ہوئے بالوں میں سے سفیدی جھانکنے لگتی ہے۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"کیا بات۔ آج کچھ جلدی آگئے؟"

وہ بیوی کو بغیر پلکیں ہلائے دیکھنے لگا۔ جب بھی وہ اس طرح بغیر پلکیں ہلائے دیکھا کرتا تو محسوس ہوتا جیسے وہ ساری دنیا کو اپنی پلکوں پر ڈھیر کی طرح اکٹھا کر کے بیٹھا ہے اور جب پلکیں ہلاتا تو لگتا جیسے وہ ساری دنیا کو غصے کی آگ میں جلا کر راکھ کر دینے کے لیے بار بار دیا سلائیاں رگڑ رہا ہے۔

"آج سورج گرہن پڑے گا۔ پورے چوبیس سال بعد۔" وہ افسردگی کے ساتھ بولا۔

"تو...... تو تم کیا کرو گے؟ کیا کالا چشمہ لگا کر گرہن لگنے کا منظر دیکھو گے" وہ درشتی کے ساتھ بولی۔

اس نے بیوی کے درشت لہجے کو محسوس کیا اور یہ سوچنے لگا کہ وہ گرہن لگنے کا ایک منظر دیکھ چکا ہے...... چوبیس سال پہلے کالے شیشے کے بغیر مگر آسمان پر نہیں سڑک پر۔

بیوی بھی گویا اس وقت اس کے سر ہی ہوگئی تھی۔

"تمہیں اپنا بہروپیا پن جتنا دکھانا ہے، دکھاؤ۔ مگر اس سڑی گلی، اگھور وردی کو تو لے جا کر کوڑے میں پھینک آؤ۔ اس میں نہ جانے کتنی جوئیں اور پسو پڑ گئے ہوں گے۔ ایسی بھی کیا باپ کی نشانی۔ تم کیسے اسے برداشت کرتے ہو؟ اس پر تمہارے باپ کے خون کے دھبے نظر آتے ہیں۔"

اور یہ حقیقت تھی کہ وردی پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے جو وردی کے دھلتے رہنے کے ساتھ اور وقت گزر جانے کے باعث کالے اور جامنی رنگ میں بدل گئے تھے۔ اس میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے۔ برسات میں پانی میں بھیگ کر اس سے ایسی سڑاندھ نکلتی کہ قریب

کھڑے آدمی کو اپنی ناک پر ہاتھ رکھنا پڑ جاتا۔ بوا نے باپ کے مرنے کے بعد ہی خون سے سنی اس منحوس وردی کو پھینک دینا چاہا تھا مگر اس نے ضد پکڑ لی تھی۔

''وردی نہیں جائے گی۔ ہر گز نہیں جائے گی۔ وردی میری ہے۔'' وہ رو رو کر کہہ رہا تھا۔ آخر بوا کو بن ماں باپ کے اس ننگی سے بچے کے سامنے ہار ماننا ہی پڑا۔

''سنو! پرانے کپڑے فروخت کر کے اب مجھ سے گزر بسر نہیں ہو سکتی۔ تم یہ بہروپیا پن چھوڑ کر کوئی ٹھیلہ ہی لگا لو۔'' بیوی نے اس بار نرمی اور سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔ بیوی کے سانولے ماتھے پر پھر چند دانے ابھر آئے تھے، جیسے مچھروں کے کاٹنے سے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی اس کی نظر ان دانوں پر پڑی، اسے اپنے جسم کے اندر ایک جانی پہچانی سی بو کا احساس ہوا۔ ایک ایسی بُو جو صرف شہوت جگاتی تھی اور کھال کے مساموں میں کوئی شے باہر سے آکر رینگنے لگتی ہے۔ اس کی بیوی نے اس بُو کو پہچان لیا۔

''ہوش میں رہو۔'' اس نے حقارت کے ساتھ کہا اور اندر چلی گئی۔

وہ تھوڑی دیر یوں ہی فرش پر بیٹھا رہا، پھر لیٹ گیا اور بوا کو یاد کرنے لگا جسے گزرے ہوئے دس سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی بوا کی سسرال کی ایک دور کی رشتے دار ہوتی تھی۔ وہ ایک مطلقہ عورت تھی جس کے کوئی بچہ نہ ہو سکا تھا۔ بوا نے اس کے ماں باپ کو پتہ نہیں کیا پٹی پڑھائی تھی کہ وہ اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ بیوی کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی ضرور تھیں مگر ان میں کوئی جاذبیت نہ تھی بلکہ وہ ہمیشہ اس طرح پھٹی پھٹی رہتیں جیسے ان میں تنکا پڑ گیا ہو اور وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے کسی سے نکلوانا چاہتی ہو۔ دبلی پتلی ہونے کے باوجود اس کے کولہے بھاری اور ضرورت سے زیادہ گول مٹول تھے۔ اس کے پستان چھوٹے اور ڈھلکے ہوئے تھے مگر ان میں گولائی نام کو نہ تھی۔ وہ

کچھ لمبوترے سے تھے۔ ایک عجیب بات اس میں یہ بھی تھی کہ اکثر اس کے ماتھے پر ایسے سرخ سرخ دانے ابھر آیا کرتے تھے جو گرمیوں میں نکلنے والی پھنسیوں سے مشابہ تھے یا پھر مچھر کاٹے سے۔ ان دانوں کا کوئی وقت یا موسم نہ تھا۔ وہ پر اسرار انداز میں کبھی بھی نکل سکتے تھے۔ اور جب وہ نکلتے تو انھیں دیکھ کر وہ جنسی خواہش سے بے قابو ہو جاتا۔ ایک ایسی خالص اور ایمان دار جنسی خواہش جس میں محبت کی ملاوٹ کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ بس یہی وہ زمانہ ہوتا جب رات کے اندھیرے میں پلنگ پر وہ دونوں وحشیوں کی طرح مضحکہ خیز انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھا پائی سی کرتے، جب تک کہ ان کی سانسیں ڈھیلی نہ پڑ جاتیں۔ تب اس کا مضبوط جسم سرخرو ہوتا مگر اس کا چوہے جیسا سر تکیے پر ڈھلک جاتا۔

پھر بیوی اندر والے کمرے میں جا کر سو جاتی جہاں تک اس کے خراٹوں کی آواز نہ آتی تھی۔

یقیناً یہ ایک بھیانک بات تھی مگر ہر ایمان دار اور خالص جذبے میں ایک قسم کا نا قابل فہم عنصر اور اس کا بالکل نجی بھیانک پن ہوتا ہی ہے جس کے لیے اسے معاف کر دینا چاہیے۔

اور یہ تو سب کو عیاں تھا کہ اس کی بیوی کے بچے نہ ہو سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے ایک ایسے شخص سے بیاہ دیا گیا تھا جو دنیا کی نظر میں صحیح الدماغ نہ تھا، بلکہ شاید پاگل تھا۔

یہی سبب تھا کہ ٹھیک ٹھاک پڑھ لکھ لینے کے باوجود اس کو محکمہ ڈاک میں اپنے باپ کی جگہ نوکری نہ مل پائی تھی۔ ہاں، اس کے بھائی کو ضرور گول ڈاک خانے میں لیہی اور گوند بنانے کی ایک حقیر سی نوکری مل گئی تھی۔ بڑا بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ مکان میں رہتا تھا اور چھوٹے بھائی کے سنکی پن سے اتنا نالاں تھا کہ اس سے تقریباً ہر قسم کا

تعلق ہی توڑ چکا تھا۔

''بہروپیا۔ بہروپیا!'' باہر گلی میں بچوں نے آواز لگائی۔

وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ شاید اسے جھپکی آ گئی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ سورج گرہن گزر چکا تھا۔ شاید ساتھ خیریت کے۔ صرف اس کے ہاتھ پیر کچھ گرم سے تھے۔

''بہروپیا!'' باہر بچے پھر چلائے۔

اور یہ حقیقت تھی کہ وہ ایک بہروپیا تھا۔ مگر کیسا عجیب بہروپیا، کہ صرف ڈاکیے کا ہی بہروپ بھرتا تھا۔ بچپن سے ہی وہ باپ کی زندگی میں ہی نہ جانے کہاں کہاں کے ڈاک گھروں میں بھٹکتا پھرتا۔ باپ کی چھٹی کے دن وہ اس کی وردی پہن کر ڈاکیے کی نقل اتارتا۔ یہ سلسلہ باپ کے قتل کے بعد رکا نہیں بلکہ پاگل پن میں بدل گیا۔ محلے والے اسے چھیڑا کرتے اور یوں تو شہر میں بہت سے بہروپیے گھومتے رہتے تھے، کوئی ڈاکٹر کا بہروپ بھرتا تھا کوئی وکیل کا، کوئی ٹریفک کے سپاہی کا تو کوئی ڈاکو کا، یا چیتھڑے لگائے ہوئے مجنوں کا۔ جو بھی ہو، بہروپیے بھکاریوں سے تو بہتر تھے اور انھیں بھکاریوں کے مقابلے زیادہ عزت اور قدر کی نظر سے دیکھا جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ تو صرف ڈاکیے کا ہی بہروپ بھرتا تھا اور کچھ لوگ اسے مجذوب بھی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی بار پولیس بھی اسے غیر ملکی جاسوس ہونے کے شبہ میں پوچھ تاچھ کے لیے تھانے لے گئی تھی۔ لیکن اب اسے سب جاننے لگے تھے۔ وہ تقریباً تمام شہر میں مذاق کا نشان بن گیا تھا۔ خاص طور پر محکمۂ ڈاک کے لیے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ بخوبی جانتا تھا کہ مذاق اڑانے والوں اور مذاق کا موضوع بننے والوں میں آپس میں کچھ بھی مشترک نہیں ہوتا۔ یہ کوئی رشتہ ہی نہیں ہے، اگرچہ دنیا کے سب سے زیادہ دلچسپ اور تفریح کن رشتے کا التباس ضرور پیدا کرتا ہے۔ یہ دونوں قطعی طور پر مختلف دنیاؤں کی مخلوق

ہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی دو دنیائیں۔ مذاق اڑانے والوں کے سر طاعون سے بیمار چوہوں جیسے نہیں ہوتے اور سوتے وقت انھیں بھیانک خراٹے نہیں آتے، وہ ایک الگ دنیا کے بہروپیے ہیں۔

باہر گلی میں اب بہت سے بچوں نے مل کر ہانک لگائی۔

"بہروپیے ...... بہروپیے! کہاں ہو تم؟"

مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ وہ گھر سے باہر آنے لگا۔ محلے کے بچے اسے دیکھ کر اچھلنے کودنے لگے۔ پھر وہ چلائے۔

"وردی پہن کر آؤ۔ وردی پہن کر آؤ۔"

وہ واپس گھر میں وردی پہننے کے لیے دوڑا۔

صبح سے شام تک اور کبھی کبھی رات میں یہی اس کا مشغلہ تھا جسے وہ ایک عین اخلاقی فرض کی حیثیت سے سالہا سال سے انجام دیتا آرہا تھا۔ بہروپیا بن کر اپنی دانست میں وہ معاشرے میں مسرت پیدا کر رہا تھا۔ ایک ایسی مسرت جو حیرت زدگی کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ معصوم حیرت زدگی جو صرف اس لیے غائب ہوتی جارہی تھی کہ خود لوگوں نے نہ جانے کتنے نقاب اوڑھ رکھے تھے۔ معصوم حیرت زدگی بہر حال لوگوں کو اپنے اصل روپ کے اندر تک تو لے جاتی تھی مگر وہ تھا ہی کیا؟ اس کی اوقات ہی کیا تھی؟ وہ تو شاید ایک ڈاکیہ بھی نہ تھا۔ صرف ڈاکیے کا بہروپیا تھا جو دوپہر، شام، رات ہر وقت گلی، کوچوں، ویران علاقوں اور کبھی کبھی کالی ندی کے سنسان اور ویران کناروں پر بھی بھٹکتا پھرتا تھا۔ وہی کالی ندی جو شاید اس کے جسم سے امر بیل کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

وہ پیدل دوڑ دوڑ کر، ڈاک بانٹا کرتا اور یہ ڈاک کچھ اس طرح کی ہوتی۔

ردی کاغذ کے ٹکڑے، بچوں کی ردی میں بیچی گئی کتابیں اور کاپیوں کے اوراق، سودا فروخت کرنے والوں کی اخباری یا بانس کے کاغذ کی بنی تھیلیاں، جن میں وہ جھوٹ موٹ کے پارسل بنا لیتا۔ ان میں جنگلی پھول، گھاس اور کنکریاں وغیرہ بھر دیتا تھا۔ کسی غریب بچے کو سڑک کنارے روتا ہوا دیکھتا تو بھاگ کر اس کے پاس آتا اور کہتا۔

"لو تمھاری چٹھی آئی ہے۔" اور پھر اس۔ کے ہاتھ میں ایک میلا سا دبا مسلا رنگین کاغذ پکڑا دیتا۔ جس پر کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہوتا تھا، کیوں کہ تحریر کے بغیر کاغذ کی کوئی اہمیت نہ تھی اور ایک چھوٹا بچہ بھی اس نکتے کو بہر حال بخوبی سمجھتا تھا۔ اس کے تھیلے میں پرانے رنگین کلینڈر، پرانے شادی کے کارڈ، سال گرہ یا تیوہاروں کی مبارک باد وغیرہ کے کارڈ بھی رہتے تھے۔ بچوں کی طرح وہ ان بوڑھے ماں باپ کو بھی کوئی نہ کوئی کاغذ یا کارڈ دے کر بہلا دیتا تھا جو اپنی اولادوں کے خطوں کے انتظار میں تقریباً مردہ ہو چکے تھے۔

کیا واقعی یہ ایک قسم کی اداکاری تھی؟ صبح سے شام تک یہ بہروپ بھرنے کے بعد اس کے پاس صرف ایک خالی اور بے معنی دنیا رہ جاتی تھی جو کہ صرف اس کا ہی نہیں بلکہ ہر عظیم اداکار کا مقدر ہوتی ہے۔ مگر نہیں اس خالی اور بے معنی زندگی میں رات کے وقت اس کے لیے ایک شے اور پوشیدہ تھی اور وہ تھی اس کے خراٹے۔ یہ کوئی عام خراٹے نہ تھے۔ اس کے سو جانے کے بعد اس کے قریب لیٹ کر دنیا کے کسی بھی شخص کو نیند نہیں آسکتی تھی۔ دوسروں کے لیے یہ بے حد خوف ناک اور پراسرار خراٹے تھے۔ ویسے تو یہ بیماری اسے ہمیشہ سے تھی مگر بچپن میں مانجھے سے گردن کٹ جانے کے بعد سے یہ بڑھ گئی تھی اور گزشتہ دو سال سے اس نے بے حد شدت اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ خراٹے لینے کی وجہ ناک کے پچھلے حصے، تالو، حلق کے کوے اور زبان کی کوئی نہ کوئی خرابی ہوتی ہے۔ دراصل ہوا کا راستہ بند

ہو جانے سے آدمی خراٹے لیتا ہے۔اس کے لیے یا تو تالو کا آپریشن کرانا ہوگا یا پھر حلق کے کوے نکلوانے ہوں گے۔ظاہر ہے کہ نہ تو وہ اپنے ظاہری یا جسمانی زندگی کے تئیں اتنا چوکنا تھا اور نہ کوئی دوسرا اس کے لیے یہ دردِ سر مول لے سکتا تھا۔مگر ڈاکٹروں کا اندیشہ تھا کہ اس طرح کے خراٹوں میں دل پر دباؤ بڑھتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے کبھی بھی سانس رک سکتی تھی۔ دل کی دھڑکن بند ہو سکتی تھی اور وہ مر سکتا تھا۔

کبھی کبھی جب اس کے گلے کے غدود بڑھ جاتے تو یہ خراٹے اٹک اٹک کر آنے لگتے۔ کچھ اس طرح جیسے تالو میں ازل سے بیج کی صورت پوشیدہ 'شبدٗ ناک اور منھ سے نکلتی ہوئی ہوا کے سہارے باہر آنا چاہتے ہوں۔کسی نادیدہ، پر اسرار اور عظیم زبان کے حروف تہجی میں شامل ہو کر نیند کی خاموشی کے خلاف ایک بیانیہ کی تشکیل کرنے کے لیے۔یہی وجہ تھی کہ اس کے یہ خراٹے اداس اور دکھی تھے۔ایسے خراٹے موت کے کتنا قریب تھے اور شاید اس کالی ندی سے بھی جو اس کے شہر میں ہر طرف بہتی پھرتی تھی۔

وردی پہن کر اور کاغذوں سے بھرا ہوا خاکی رنگ کا تھیلا لیے ہوئے وہ گھر سے پھر نکلا اور گلیوں گلیوں دوڑتا ہوا گھومنے لگا۔کسی بچے کے ہاتھ میں کوئی رنگین کاغذ تھماتا ہوا، کسی راہ گیر کو کسی ایسی شادی کارڈ دیتا ہوا جس کی تاریخ نکل چکی تھی۔ایک سچے بہروپیے کی طرح اپنا فرض پورا کرتے ہوئے وہ دوڑ دوڑ کر اپنی ڈاک بانٹا کرتا۔دوڑنے میں اس کی سانس بری طرح پھول جاتی تب وہ دم بھر کو سڑک کنارے یا کسی دوکان کے پٹلے پر بیٹھ جاتا۔مگر آہستہ چلنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔شاید اسے معلوم تھا کہ جدید انسان کے ارتقا میں دوڑنے کا کتنا بڑا ہاتھ رہا ہے۔دوڑنے میں انسانوں کی گردن اور ریڑھ کی ہڈیوں کے گریوں نے تمام دھچکے

برداشت کرنا سیکھ لیا۔ دونوں بانہوں اور کاندھوں نے توازن برقرار رکھنے کا کام انجام دیا ہے اور یہ انسانی کولہے ہی تو ہیں جو دوڑتے وقت تیزی سے مڑنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ قدیم انسان جب درختوں سے نیچے اترے تب دوڑ کا سلسلہ شروع ہوا۔

مگر وہ اور بھی تیز دوڑنا چاہتا تھا، تقریباً اُڑنا چاہتا تھا۔ مگر کسی پرندے کی طرح نہیں بلکہ ایک پاگل ہوا کی طرح...... آزاد۔ ادھر سے اُدھر۔ تقدیریں بدلتی ہوئی ہوا، ریگستان میں ریت کے تودوں کی جگہ بدل کر رکھ دینے والی ہوا۔

وہ اکثر سوچا کرتا کہ زمانہ کسی چٹھی رساں کے قدموں کے بنائے ہوئے راستوں پر کیوں نہیں چلتا۔

اور یوں تو زمانہ قیامت کی چال چل گیا تھا۔

وہ بہت تیز رفتار ہو گیا تھا۔ مگر انسانی جسم کی حرکت و رفتار تقریباً ایک مردے کے جسم کے برابر ہی رہ گئی تھی۔ جسم نظر آتے تھے، پہیوں پر بیٹھے بے جان مورتیوں کی طرح۔ پہیئے ہوا سے باتیں کرتے تھے۔ انسانی جسم نہ ہلتا تھا۔ اس کو پسینہ تک نہ آتا تھا۔ نظر نہ آنے والی قوت کے کاندھوں پر سوار پل بھر میں لوگ ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر لیتے تھے۔ صرف ان کی انگلیاں ادا کے ساتھ ہلتی تھیں اور اس کے خیال میں یہ ایک فحش بات تھی۔ سب کچھ مایوس کن حد تک خوب صورت ہوتا جا رہا تھا۔

یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت تھی کہ لوگ اب اس کے اس بہروپ سے تقریباً اکتا گئے تھے۔ پھر بھی بھکاریوں کی طرح دن بھر میں اسے چند پیسے مل ہی جایا کرتے جن سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی تھی۔ اسی لیے وہ ان پیسوں سے پرچون کی دوکان پر جا کر ردی کاغذ خرید لاتا۔ گھر کا خرچ بیوی ہی چلا رہی تھی۔ وہ بڑے شہر جا کر وہاں سے پرانے کپڑے خرید لاتی اور

یہاں غریب گھروں میں بیچ آتی۔ مگر پرانے کپڑوں میں آج تک اسے کبھی ڈاکیے کی وردی بھولے سے بھی نہ مل پائی۔ ہاں کچھ سال پہلے پرانے کپڑوں میں اسے ایک بوسیدہ سے رنگ کا کوٹ ضرور مل گیا تھا۔ یہ کوٹ کسی ایسے شخص کا رہا ہوگا جسے موٹاپے کی بیماری ہو۔ جاڑوں میں کبھی وہ اسے پہنتا تو اس کا سارا جسم اس میں چھپ جاتا۔ وہ اس کوٹ میں بھس بھرا ہوا آدمی نظر آتا اور جس طرح بھس بھرے شیر کی بے چارگی صاف اس کے منھ سے عیاں ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اس کا چوہے جیسا سر مضحکہ خیز انداز میں بے چارہ ہو جاتا۔

اور لوگ...... وہ بہروپیے تو کیا، دراصل ڈاکیے سے ہی اکتا گئے تھے اور خود ڈاکیہ بھی اپنے وجود کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے لوگوں کی زندگی سے نکل کر حاشیے پر آگیا تھا۔ وہ بس اب سمن، قانونی نوٹس، شیئر مارکیٹ کے بانڈ، ٹیلی فون کے بل، منی آرڈر اور کچھ میگزین وغیرہ ہی اِدھر سے اُدھر ڈھوتا نظر آتا تھا۔ بمشکل ہی کسی کے پاس کوئی خط ہوتا تھا۔ لوگوں نے خط لکھنا ہی چھوڑ دیے تھے۔ دنیا کی ہڈیاں سکڑ گئی تھیں۔ وہ بونی ہوگئی تھی جس پر کروڑوں کی تعداد میں انسان اس طرح چمٹے ہوئے تھے جیسے حلوائی کی دکان پر کھلی ہوئی مٹھائی پر چیونٹیاں اور مکھیاں۔ بس ایک بالشت بھر کی دوری رہ گئی تھی جس میں دنیا کو سر سے لے کے پاؤں تک چھوا جا سکتا تھا۔ لوگوں کو صرف خبروں کی ضرورت تھی، کسی پیغام یا ہدایت کی نہیں۔ خبریں پلیگ کے زہریلے جراثیم کی طرح تھیں۔ وہ دنیا پر برس رہی تھیں۔ لوگ خبروں کے اس لیے خواہاں تھے کہ وہ اپنی موت میں دوسروں کی شمولیت بھی چاہتے تھے۔ وہ وبا میں مرنا پسند کرنے والے لوگ تھے اور یقیناً انفرادی موت سے اجتماعی موت کی طرف بھاگنا قدرے عافیت کی بات تھی۔

ویسے تو ڈاکیہ ہمیشہ ہی انسانوں کے پیغامات، ان کے دکھ سکھ کو ایک دوسرے تک

پہنچانے میں اپنی انفرادی شخصیت اور ساخت قربان کرتا آیا ہے۔ اس کی شکل سیال ہو کر بہتی ہے۔ تم اس کا اکثر نوٹس نہیں لیتے، کیوں کہ وہ انسانوں کے شادی اور مرگ کے کاغذوں کے حساب کتاب ڈھوتے رہنے میں تجریدی ہو جاتا ہے۔ ڈاکیے گلی میں گونجتی ہوئی وہ آوازیں ہیں جن کے ہم عادی ہو گئے یا آسمان پر آوارہ گردی کرتے ہوئے وہ بادل جن سے بھیانک بارش کا کوئی امکان نہ ہو اور اس لیے وہ اپنے حصے کا رعب اور وقار کھو چکے ہیں۔

اسے یاد ہے وہ بابو کے ساتھ شادی کی ایک تقریب میں گیا تھا۔ ایک شاندار سجی سجائی محفل جہاں بابو مٹی کے رنگ کی وردی پہنے خاموش کھڑے تھے۔ وہ سہما سہما ان کی انگلی تھامے ہوئے تھا۔ محفل میں بابو کے ہاتھ پر صرف ایک نوٹ رکھ دیا گیا تھا۔ فضا میں چاروں طرف دیسی گھی کی کچوریوں کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ اس کا دل کچوری کھانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ مگر دعوت اور آؤ بھگت کے وہ دونوں باپ بیٹے حقدار نہ تھے۔ انھیں نظرانداز کر دیا گیا۔ یہ کیسی عجیب بات تھی کہ جن مسرتوں اور تقریبوں کے پیغام اور بلاوے وہ ساری دنیا میں بانٹتے پھرتے تھے، انھیں میں شرکت کے لیے ان کے پاس نہ کوئی بلاوا تھا اور نہ ہی کوئی مقام۔

گلیوں گلیوں بھٹکتے، وہ اچانک شہر کے سب سے رونق افزا بازار والی سڑک پر آنکلا۔ سڑک کے دونوں طرف نیون بلب، اونچے کھمبوں میں سڑک کی طرف منھ کیے اپنی روشنی پھینک رہے تھے۔ سڑک اتنی روشن تھی کہ اس پر گری ہوئی باریک سے باریک سوئی بھی نظر آسکتی تھی۔ دوکانوں کے ساتھ بورڈ رنگین بدلتی ہوئی روشنیوں میں جھلملا رہے تھے۔ کاروں، بسوں اور موٹر سائیکلوں کا جم غفیر تھا۔ اس بھیڑ میں فیشن ایبل، نیم عریاں گداز بدن والی پکی پکائی عمر کی عورتیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ خوشبوؤں کے ریلے اڑ رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر

آئس کریم اور چاٹ کے ٹھیلوں کے برابر ایک غبارے والا کھڑا تھا۔ وہ یہ منظر دیکھ کر سحر زدہ سا ہو گیا۔ اگر چہ وہ سینکڑوں بار ادھر سے گذرا تھا مگر آج اس سڑک کی رونق کچھ دوسری طرح کی تھی۔

ٹھیک اسی وقت ایک عجیب سی گھر گھراہٹ سنائی پڑی۔ جیسے سڑک پر کچھ گھسیٹا جا رہا ہو اور تب اس نے دیکھا۔

دور سڑک پر سامنے سے کوڑھیوں کی گاڑیاں قطار باندھے چلی آرہی تھیں۔ لکڑی کی گاڑیاں جن میں بال بیرنگ کے چھوٹے چھوٹے پہیے لگے تھے۔ ان گاڑی کی اونچائی سڑک سے بس اتنی ہی تھی جتنی ایک خاص نسل کے کتے کے پیٹ کی زمین سے ہوتی ہے۔ گاڑیاں مہیب اور کریہہ آوازوں کے ساتھ گھسٹتی ہوئی قریب آگئیں۔ کوڑھی مرد اور عورت انھیں کھینچ رہے تھے۔

مگر اس دہشت ناک منظر سے الگ ایک اور منظر بھی تھا۔ یا شاید منظر نہیں بلکہ منظر کو کھرچتی ہوئی ایک لکیر۔ ایک خراش۔ کسی کسی گاڑی میں کوڑھیوں کے معصوم بچے بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں گیس کے غبارے دبے ہوئے تھے۔ یقیناً کوڑھیوں نے بھی اپنے بچوں کے لیے رنگین غبارے خریدے تھے۔

بازار رواں دواں تھا۔ تمام افراد ان گاڑیوں سے بچ کر نکل رہے تھے۔ مگر کوڑھیوں کے بچوں کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے اونچے اٹھتے جاتے گیس کے وہ رنگین غبارے جیسے ساری دنیا کا مضحکہ اڑا رہے تھے، زندگی کا بھی اور اپنا بھی۔

اس نے خود کو شدت سے اُداس محسوس کیا۔ اس کے تھیلے میں ایسا کوئی کاغذ نہیں تھا جو وہ ان سڑتی گلتی انگلیوں میں تھما سکتا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے بہروپیے پن کی لاحاصلی کا

احساس ہوا۔

گاڑیاں آہستہ آہستہ اپنی دہشت سڑک پر گراتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئیں۔اور تب اس نے بے اختیار چیخ کر کہا۔

''میں وہ رقعہ جلد ہی لے کر آؤں گا جس میں تمہارے جسم کی کھال کو کندن کی طرح دمکنے کی خبر دی جائے گی۔تمھاری ٹیڑھی اور ناپاک انگلیاں سیدھی اور پاک ہوجائیں گی۔ چہروں پر ستواں ناک جگمگائے گی۔بس اپنے بچوں کے ہاتھوں میں غبارے تھمائے رکھنا۔یہ غبارے اونچے اڑتے اڑتے ایک دن آسمان تک پہنچیں گے اور خدا کو تمھاری داستان سنائیں گے......''

مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے منھ سے جو الفاظ باہر آرہے ہیں، ان پر لگاتار اس کے حلق کے بڑھے ہوئے غدود کا دباؤ پڑ رہا ہے۔اس لیے اس کی آواز محض ایک بھیانک خراٹے سے مشابہ ہے۔اسی لیے اپنی گاڑیاں گھسیٹتے ہوئے کوڑھیوں نے اسے نہیں سنا۔یا اگر سنا بھی ہوگا تو اس آواز کو بھی اپنی گاڑی کے پہیوں سے نکلنے والی کریہہ آواز ہی سمجھا ہوگا۔

اسے لگا جیسے اسے تیز بخار چڑھ رہا ہو۔

دور چمکتی ہوئی روشنی میں کوڑھیوں کی گاڑیوں کے بدنصیب سائے بے ہنگم انداز میں سڑک پر پڑتے نظر آئے۔پھر وہیں کہیں دب کر رہ گئے۔

اس رات جب وہ سویا تو خراٹوں کی آواز اتنی بلند تھی کہ دوسرے کمرے میں لیٹی ہوئی بیوی کو وہاں تک آتی رہی اور وہ وہاں بھی چین کی نیند نہ سو سکی۔اس بار خراٹوں کے ساتھ ان کی ہمزاد کھانسی بھی تھی۔بار بار گلے میں پھندا سی لگاتی ہوئی کھانسی۔شاید اس کے حلق کے غدود

بڑھ کر سوج گئے تھے، کیونکہ رات بھر اسے بخار بھی رہا۔ گرمی اور حبس اپنی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ پوری رات جی کو متلا کر رکھ دینے والی گرمی کے منحوس سائے میں ہی گزر گئی۔

صبح جب وہ دیر سے اٹھا تو بیوی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح چپ رہا۔ وہ جانتا تھا کہ ماتھے پر ہاتھ رکھنے کے پیچھے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

"تمھارا ماتھا جل رہا ہے۔ اور گھومو ایسی قیامت کی گرمی میں۔"

"تم نے مجھے اٹھایا نہیں۔ دن چڑھ آیا۔" اس نے اپنی گھرگھراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مجھے کیا پڑی تھی کہ اٹھاتی۔ کیا اپنی کمائی لاکر مجھے دیتے ہو؟ ویسے بھی رات اتنے خراٹے لیے ہیں اور اتنا کھانسے ہو کہ جینا دوبھر کر دیا۔" بیوی کا لہجہ بدل گیا۔

وہ خاموشی سے اٹھا۔ اس نے اپنے کاغذوں کے تھیلے کو فرش پر پلٹ دیا اور ایک سے ایک الم غلم شے کو اٹھا اٹھا کر اس طرح قرینے سے لگانے لگا جیسے کسی دفتر کا بابو فائلیں لگاتا ہے۔ بیوی نے اس کی طرف نفرت سے گھورا، پھر تیز تیز چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں گھس گئی جہاں اسے پرانے کپڑے سلیقے سے لگا کر گٹھری میں باندھنا تھے۔

اور تب اس کی نظر تھیلے سے نکلی اخبار کے کاغذ کی بنائی ہوئی ایک تھیلی پر پڑی۔ وہ چونک پڑا۔ اس پر ایک بچی کی تصویر تھی۔ آٹھ نو سال کی بچی۔ گھٹنوں تک فراک پہنے بچی کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں شاید آنسوؤں کی نمی تھی۔ بال بکھر کر اس کے ماتھے پر آرہے تھے۔ تصویر کے نیچے ایک عبارت تھی۔

سات سال کی بچی اپنی چٹھی کی تلاش میں ایک سال سے شہر کے ہر ڈاک گھر میں چکر لگاتی گھوم رہی ہے۔ "روشنی" نام کی یہ بچی ستیہ پرکاش سنگھ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ستیہ پرکاش نے

سال بھر پہلے سینٹرل جیل عزت نگر میں خودکشی کرلی تھی۔ اس پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ستیہ پرکاش نے یہ چٹھی اپنی خودکشی سے پہلے جیل کے کسی کارکن کے ذریعے اپنی بچی کے نام پوسٹ کروائی تھی۔ جیل کے کارکن کا بیان ہے کہ وہ چٹھی روشنی کی سال گرہ کا کارڈ تھی۔ مگر سال گرہ کی مبارکباد محکمۂ ڈاک کی گھٹیا اور غیر ذمہ دارانہ کارکردگی کی وجہ سے ایک برس بیت جانے پر بھی روشنی کو نہ مل سکی۔ محکمۂ ڈاک کا بیان ہے کہ شاید وہ چٹھی 'ڈیڈ لیٹر' بن گئی ہے اور اسے آسانی سے اب تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔ اُدھر روشنی ماں باپ کے نہ رہنے اور چٹھی کے کھو جانے کے غم میں تقریباً پاگل ہو چکی ہے۔ وہ نہ کچھ کھاتی ہے، نہ پیتی ہے۔ بس صبح سے لے کے شام تک چھوٹے بڑے ہر طرح کے ڈاک گھروں کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔

نائب وزیر برائے امورِ خزانہ نے بچی کی پرورش اور تعلیم کے لیے اپنے فنڈ میں سے ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ معصوم روشنی کو باپ کی طرف سے اپنی سال گرہ کی مبارکباد مل پائے گی یا نہیں؟"

وہ بری طرح بے چین ہو گیا۔ اس کے جسم کا سارا بخار اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اتر آیا۔ اور اس کا چوہے جیسا سر آہستہ آہستہ دائیں بائیں ہلنے لگا۔ وہ تیزی سے فرش پر سے اٹھ گیا۔ سامنے سادہ ورقوں والی وہ کاپی رکھی تھی جس میں اس کی بیوی پرانے کپڑوں کے خرید و فروخت کا حساب لکھواتی تھی۔ اس نے کاپی میں سے ایک سادہ ورق پھاڑا۔ کچھ لکھنے کے لیے اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کوئی قلم، پنسل، افسوس کہ کوئلے کا ٹکڑا تک نہ تھا۔ وہ گھبرانے لگا۔ اب اور زیادہ وقت برباد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے سوچا۔

اچانک اس نے دیکھا کہ سامنے پلنگ پر تکیے کے اوپر بیوی کا ہیئر پن پڑا ہوا ہے۔ جس میں بیوی کے دو تین کھچڑی بال پھنسے ہوئے تھے۔ اس نے جھپٹ کر ہیئر پن اٹھایا اور

پوری طاقت کے ساتھ اپنی بائیں ہتھیلی میں بھونک دیا۔لال لال خون آہستگی کے ساتھ رسنے لگا۔تب اس نے دوسرے ہاتھ کے کلمے کی انگلی کے پورے کو اس خون سے تر کیا اور سادہ ورق پر لکھا۔

پیاری بیٹی روشنی کو جان نچھاور کرنے والے باپ کی طرف سے جنم دن بہت بہت مبارک ہو۔

-ستیہ پرکاش

پھر اس نے عبارت کے نیچے خون سے گلاب کا ایک پھول بھی بنا دیا۔ورق کو پھونک مار کر سکھانے کے بعد اسے احتیاط کے ساتھ کھونٹی میں ٹنگی وردی کی اندرونی جیب میں رکھ دیا۔اس کے بعد وہ اخباری کاغذ کی اس تھیلی کو ہاتھ میں تھامے تھامے دروازے کی طرف دوڑا مگر اسے خیال آیا کہ اس نے وردی تو پہنی ہی نہیں ہے۔تب بہروپیے نے ڈاکیے کی وردی پہنی،سر پر ٹوپی لگائی اور بھوکا پیاسا ہی نکل کھڑا ہوا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔موسم دم گھونٹ دینے کی حد تک حبس زدہ تھا۔ماحول اور فضا میں بے حد دھول اور دھند تھی۔ایسا گمان ہوتا تھا جیسے ساری دنیا جس مٹی سے بنی تھی،وہ آہستہ آہستہ کھرچی جا رہی تھی۔توڑی جا رہی تھی۔بالکل اسی طرح جیسے مٹی کی کسی عظیم الشان مورت کے توڑنے پر دھول کا ایک غبار اٹھتا ہے۔ہوا کا تو نام بھی نہ تھا۔جو بھی ہوا تھی وہ اس کی اپنی تھی اور اس کے دوڑنے سے پیدا ہوتی تھی۔

اور وہ دوڑ رہا تھا۔ریل سے کٹے ہوئے اس بدبخت ڈبے کی طرح جو ویران راتوں

میں ریل کی پٹریوں پر اکیلا ہی دوڑتا تھا، بغیر انجن کے۔

آج اس کے ساتھ بچوں کی بھیڑ نہ تھی۔ سڑکیں، گلیاں ویران پڑی تھیں۔ بار بار وہ اخبار میں چھپی اسی بچی کی تصویر دیکھتا۔ اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا پھر اِدھر سے اُدھر نکل جاتا۔ وہ دھند کے ایک بگولے کی طرح چکرا رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ بچی کسی ڈاک خانے پر ہی ملے گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ کالی ندی کے پُل پر بے تحاشا بھاگنے لگا۔ پُل سے ایک ڈیڑھ میل کی دوری پر ہی وہ چھوٹا سا گول ڈاک خانہ تھا جہاں اس کا بھائی لیبی اور گوند بنانے کا کام کرتا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ اس چھوٹے سے ڈاک خانے کے اندر کہیں سرنگیں تھیں جو کہ زمین کے اندر ہی اندر کائنات کے سارے ڈاک خانوں سے جا ملتی تھیں۔

اتنا تیز دوڑنے پر بھی آج ڈاک گھر آتا نظر نہیں آتا۔ کدھر گیا؟ اس نے فکر مند ہو کر سوچا۔ اب اسے احساس ہوا کہ پُل پار کرنے کے بعد وہ غلط سمت کو نکل آیا تھا۔

وہ حواس باختہ ہو کر واپس مڑا اور مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ دھند اور مٹی کا غبار اور دبیز ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سانس بری طرح پھولنے لگی۔ اس کی ناک اور آنکھوں میں دھول بھر گئی تھی۔ اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ وہ ایک لمحے کو رکا اور سینے میں نہ سماتی ہوئی سانسوں کو درست کرنے لگا۔ اس کے منھ اور ناک سے مٹی کی بو آتی تھی۔

وہ پھر دوڑنے لگا اور تب دور وہ نظر آیا۔ وہ پرانا چھوٹا سا گول ڈاک خانہ۔ وہ امید سے بھر گیا۔ جلدی جلدی بھاگتے ہوئے وہ اس تک پہنچ گیا۔

گول ڈاک خانہ دھند اور دھول کے پیلے غبار میں لپٹا خاموش کھڑا تھا۔ اس کے صدر دروازے پر ایک موٹا سا زنگ آلود تالا جھول رہا تھا۔

اُف! آج اتوار تھا۔ اس نے افسوس اور صدمے کے ساتھ سانس بھری اور ڈاک خانے کی زرد دیوار سے پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اب روشنی کو وہ کہاں تلاش کرے؟ روشنی کہاں ہوگی؟ اس بے رحم اور بے حس دنیا میں وہ اپنے باپ کی چٹھی کا انتظار کر رہی ہے مگر کہاں؟ کدھر؟

اس کے جی میں آیا کہ وہ گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر وہ جانتا تھا کہ وہ سب اس وقت بھی نیند میں ڈوبے ہوں گے۔ یہ شہر تو مرگی کے ایک مریض کی طرح تھا جہاں ہر شخص بے ہوش تھا یا ایک پاگل نیند کا عادی۔ افسوس کہ ایسے شہر میں کوئی خط، کوئی پیغام یا کوئی تہنیت نامہ کس طرح دیا جا سکتا تھا۔

بہر حال، وہ پھر اٹھا۔ اسے اپنا فریضہ ادا کرنا تھا۔ اس بار تیز تیز چلتے ہوئے اسے غیر معمولی تھکن کا احساس ہوا۔ سامنے دور تک سنسان سڑک پھیلی ہوئی تھی۔ کاش کے وہ اڑ سکتا۔ مگر بعد میں اس نے یہ بھی سوچا کہ اسے اپنے جسم پر بال و پر نہ ہونے کا افسوس نہ کرنا چاہیے۔ پرندے ارتقا کے سفر میں انسان سے اسی طرح پیچھے رہ گئے تھے جس طرح فرشتے۔

اسے یاد آنے لگا کہ کسی دن کوئی کہہ رہا تھا کہ ڈاکیے کی وردی بجائے خاکی کے اب نیلی ہوا کرے گی۔ مگر اسے یہ منظور نہیں، کیوں کہ ڈاکیہ نیلے آسمان سے پر لگائے زمین پر اترتا ہوا کوئی پیغام رساں نہ تھا۔ وہ خلا سے نہیں آرہا تھا۔ ڈاکیہ تو زمین کا بیٹا تھا۔ وہ زمین سے زمین پر ہی چلتا تھا۔ اس لیے اس کو تو مٹی اوڑھے ہوئے ہی گھومتے رہنا چاہیے جو کہ زمین کا رنگ ہے۔

اچانک وہ پھر تیز دوڑنے لگا۔ دوپہر گیا، سہ پہر گزر چکی تھی۔ اور اب تو شام قریب تھی۔ اگرچہ دھند کی اس چادر کے نیچے وقت اپنے خدوخال مسخ کر چکا تھا۔

اس کا سارا دن اسی طرح بھٹکتے بھٹکتے ختم ہو گیا۔ شہر پر مٹی برس رہی تھی جس میں وہ خود بھی

خاک، دھول اور مٹی کا ایک چلتا پھرتا پتلا ہی نظر آرہا تھا۔

اچانک سامنے اسے کالی ندی بل کھاتی ہوئی نظر آئی۔ وہ بھٹکتے بھٹکتے ندی کے کنارے آنکلا۔ کنارے ویران پڑے تھے۔ وہ رک گیا۔ اب بارش ہونا چاہیے۔ اس نے خواہش کی۔ صرف بارش ہی زمین سے آسمان تک تنے ہوئے مٹی کے اس مہیب پردے کو دھو کر مٹا سکتی ہے۔

اور یقیناً وہ آرہی تھی۔ اسے بارش کی آہٹ سنائی دی۔ وہ کہیں دور ہو رہی ہوگی مگر اس کے آگے آگے چلنے والی ہواؤں کا ایک اداس، ٹھنڈا جھونکا ادھر کو آنکلا۔

اس نے آسمان کی طرف منھ اٹھایا۔ ایک بوند اس کے ماتھے پر گری اور پھر کوندے، گرج چمک اور تیز ہواؤں کے ساتھ وہ خاک اور دھول کے اس خواب غفلت میں مبتلا شہر پر برسنے لگی۔ بارش نے پانی سے بنے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے دھند کو مسل کر رکھ دیا۔ کالی ندی کے کنارے اندھیرے ہونے لگے۔ بارش بہت تیز تھی۔ آہستہ آہستہ ندی کے کنارے کی زمین دلدل بنتی جا رہی تھی۔ پانی کے زور سے ندی میں جیسے سیلاب آگیا تھا۔ اس سیلاب کا پانی اسی طرح زمین پر پھیل رہا تھا جیسے گھاس کو چرتا ہوا جانور۔

تیز ہوا میں اس کی وردی اڑی جا رہی تھی۔ اس نے تصویر والا اخبار سنبھال کر وردی کی جیب میں رکھ لیا۔ مگر اب واپس جانا ناممکن تھا۔ واپس جانے کے لیے گھونگے کی مانند رینگنا ضروری تھا۔ ارتقا کے ٹوٹے ہوئے پیر صرف آگے کی طرف گھسٹ سکتے تھے۔ گوشت کے لوتھڑوں کی طرح لڑھکتے ہوئے ہی سہی، مگر آگے کی طرف۔

دکھ اس کے اندر اس طرح اکٹھا ہو گیا جیسے کسی گڈھے میں پانی۔ اور تب اس نے اپنے پیغمبر کو یاد کیا۔ جبرئیل کو یاد کیا اور بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فرشتے جبرئیل

علیہ السلام کے بازوؤں میں پَر تھے اور جو اللہ کے کلام کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے تھے۔ اس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد مانگی کہ 'ستیہ پرکاش' کا پیغام 'روشنی' تک پہنچے۔

اسے اب اپنی بائیں ہتھیلی میں سخت درد محسوس ہوا۔ ہتھیلی پھول کر کپا ہو گئی تھی۔ وہ بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑے بارش اور ہوا کے سخت دباؤ سے گویا پھٹنے لگے۔ اس کا بخار اس کے جسم پر گرتی ہولناک بارش کے نیچے دبا کچلا پڑا تھا۔

اب اسے ایک بھیانک نیند آتی محسوس ہوئی مگر نیند کا یہ غلبہ شاید صرف اس کے جسم پر تھا۔ اس کی روح کو تو اس نیند کے خلاف چلتے ہی جانا تھا۔ اس لیے اس کی آنکھیں بار بار نیند سے جھک جھک کر چھوٹ جاتی تھیں۔

(۵)

دلدل میں چاقو

رات تقریباً آدھی بیت گئی تھی جب کچھ آدمی اسے اس حالت میں گھر لے کر آئے کہ اس کے منھ سے خراٹے جاری تھے۔ بارش نے رکنے کا نام نہیں لیا تھا۔ اس کی وردی کیچڑ اور پانی میں سنی ہوئی تھی۔ بیوی نے ہراساں ہو کر جب اس کی وردی اتار کر کھونٹی میں ٹانگی تو پانی میں بھیگ جانے کے سبب اس میں سے ایسی بدبو آ رہی تھی جیسی اصطبل سے آتی ہے۔

وہ سیدھا سیدھا پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ بائیں ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا زخم تھا مگر ہتھیلی اتنی سوج گئی تھی کہ وہ کسی انسان کی نہ ہو کر کسی عفریت کی ہتھیلی معلوم ہوتی تھی۔

کچھ لوگوں نے مل کر اس کے بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر سوکھے کپڑے پہنا دیے اور ایک چادر سے اس کے جسم کو ڈھک دیا۔اس کی آنکھیں بند تھیں اور منھ آدھا کھلا ہوا تھا جس سے بلند آواز میں وہ وحشت ناک خراٹے لگاتار آئے چلے جارہے تھے۔

''ذرا بارش کم ہو تو ڈاکٹر کو لے کر آتے ہیں۔'' کوئی بولا۔

کھونٹی کے نیچے جہاں اس کی وردی سے ٹپکتا ہوا پانی فرش کو گیلا کر رہا تھا، اس کی بیوی اس جگہ کو ایک کپڑے سے پونچھنے لگی۔اسی وقت اس نے اخباری کاغذ کی ایک بڑی سی تھیلی کو دیکھا جو پانی میں بھیگ کر گل چکی تھی۔اس کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ احتیاط کے ساتھ تھیلی اٹھا کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

کوئی تصویر تھی جس کے نقش و نگار بارش کے پانی نے اپنے اندر جذب کر لیے تھے۔ تصویر کے اوپر اخبار کی تاریخ قدرے مٹ جانے کے باوجود پڑھی جا سکتی تھی۔

وہ آج سے ٹھیک چودہ سال پرانا اخبار تھا۔

بیوی نے تھیلی اٹھائی اور کمرے سے باہر آنگن کی موری میں پھینک دی۔

''اسے جھنجھوڑ کر ہوش میں لائیں؟''

مگر کیا وہ واقعی بے ہوش تھا؟

اگر یہ ممکن تھا کہ کسی کا عکس آئینے میں نظر نہ آئے اور آئینے سے کہیں بہت دور جا کر بھٹکے تو شاید اس کا عکس بھی کہیں اور بھٹک رہا تھا۔وہ دلدل پر بنے ایک چھوٹے سے ڈاک بنگلے کے سامنے ہاتھ میں ایک خط لیے کھڑا تھا۔یہ ڈاک بنگلہ جس کی بناوٹ گرجا گھروں کی سی تھی۔ ڈاک بنگلے کے اندر ایک کمرے میں ایک لڑکی کمپیوٹر پر بیٹھی تھی اور اس کے کان سے ایک سیل فون لگا ہوا تھا۔

لڑکی کا چہرہ بے حد گول اور سفید تھا۔ اتنا سفید کہ جیسے قلت خون کا مارا ہوا ہو۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ دروازے پر سر جھکائے وہ خاموش کھڑا تھا۔

''آپ کے شوہر نے آپ کو یہ محبت نامہ بھیجا ہے۔'' اس نے لڑکی کی طرف ایک کاغذ بڑھایا جس پر ''مجھے تم سے محبت ہے'' لکھا ہوا تھا اور نیچے بچکانہ انداز میں ایک پھول بھی بنا تھا۔

لڑکی مسکرائی اور شرماتے ہوئے اس کے ہاتھ سے خط لے لیا۔

اس نے بہت ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن رکھے تھے مگر اس کے پیٹ کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے آج اس میں آنتیں واپس آگئی ہوں۔

پھر لڑکی نے اسے لگاوٹ کے ساتھ گھورا۔ ان آنکھوں میں پیار کرنے کی جنگلی سی خوشبو اتر آئی۔ لڑکی نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اس کے تپتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اس کی خاکی وردی جنگلی پھولوں کی خوشبوؤں سے بھر گئی۔

وہ دونوں یوں ہی ایک دوسرے کے بانہوں میں سمائے ہوئے دلدل میں دھنسنے لگے۔ دلدل کے نیچے پانی میں دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ جس طرح کسی مکان کی کھلی بنیادوں میں دھوپ چمکتی ہے۔

دلدل کے نیچے موجود پانی میں...... گہرے پانی میں انھوں نے ایک دوسرے سے جی بھر کر پیار کیا۔ لڑکی کے بدن پر بہت کپڑے تھے مگر اس کے بڑے بڑے پستان کپڑوں سے باہر لٹک رہے تھے۔ پستانوں سے دودھ کی ایک سفید نہر دلدل پر بہتی جاتی تھی۔

پھر وہ آہستہ آہستہ پانی سے اوپر آنے لگے۔ ساری کائنات ہی جیسے پانی سے ابھر رہی تھی۔ زندگی آ رہی تھی۔ پانی سے نکل کر زمین کی طرف۔ کائی سے لتھڑ کر دونوں کے جسم ہرے ہو گئے تھے۔

''تم مجھ سے پیار کرتی تھیں؟''

''ہاں۔''

''ماں تجھے سے میرا گلا کٹ گیا تھا۔''

''ہاں ہاں۔''

''تمہیں دادو کا کنواں یاد ہے اور وہ بند گلی؟''

''ہاں۔''

''میرے بابو کو وہیں تو مار ڈالا تھا۔ اتنا بڑا خون کا دھبہ۔'' اتنا بڑا خون کا دھبہ۔

اچانک سفید، خون سے خالی گول چہرہ اس کے منھ پر ایک غبارے کی طرح پھٹ گیا۔ غبارہ جس میں گندہ، رقیق بدبودار سفید پانی بھی تھا۔ ایسا پانی جس کی جگہ کوئی چہرہ نہ ہوسکتا تھا۔ پھر وہ سفید پانی ایک نفرت آمیز بے رحم چاقو میں بدل گیا۔ بہت تیز ہوا چلی جھاڑیاں دلدل کے چاروں طرف اس بے ترتیبی سے پھیل گئیں جیسے وہ پاگل ہوگئی ہوں۔

چاقو ایک فحش چمک کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر خاص اس کے نرخرے کی طرف۔

اسے گلا کٹنے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ وہ تو صرف کالی ندی کے بارش میں بھیگتے ہوئے پُل کو دیکھے جارہا ہے جہاں آج نہ جانے کہاں سے اتنے بہت سے کوے آکر بیٹھ گئے ہیں۔

(۶)

نیند کے خلاف

"یہ کس قسم کے خراٹے ہیں؟" اچانک بیوی نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

"اُسے تو یہ خراٹے آتے ہی ہیں۔" بڑا بھائی آہستہ سے بولا جو ابھی ابھی بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا۔

"نہیں۔ یہ ویسے نہیں ہیں۔ یہ تو کچھ اس طرح کی آوازیں ہیں جیسے کسی کا نرخرہ کاٹا جاتا ہو۔" بیوی چلائی۔

اور یہ درست تھا کہ اب اس کے منھ سے باہر آنے والے خراٹے دوسری ہی طرح کے تھے۔ یہ کسی شے کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی بے زبانی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ساتھ اب منھ بھی پورا بند تھا۔ ہونٹ آپس میں بھینچ گئے تھے۔

پھر یہ خراٹے کہاں سے نکل رہے تھے؟ شاید اس کے پورے جسم سے، جسم کے تمام مساموں سے؟ ہر بار کے خراٹے میں اس کی سانس اٹک جاتی۔ سینہ اور پیٹ اوپر کو اٹھ جاتے جیسے دم نکل رہا ہو مگر چند ہی ثانیے بعد اکھڑتی اور اٹکتی سانس پھر اپنی جگہ واپس آتی۔ اس کا سُوجا ہوا زخمی ہاتھ متواتر اس انداز میں آگے کو پھیلا ہوا تھا جیسے وہ کسی کو کوئی شے سونپ رہا ہو۔ مگر حیران کن امر یہ تھا کہ اس کا چہرہ اپنے تمام عضلات سمیت بالکل پرسکون تھا۔ بھائی نے اس کا ماتھا چھوا اور جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ماتھا انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ آنگن میں بارش کا پانی بھرتے بھرتے گھٹنوں تک آ گیا۔

مگر وہ...... وہ تو دراصل گانا گا رہا تھا۔ اس کا جسم بے حد فعال ہوگیا تھا۔ اتنا فعال اور سبک رفتار کہ بستر پر لیٹے لیٹے ہی وہ سب سے دور کہیں گاتا ہوا چلا جارہا تھا۔ کوئی گیت تھا جو لوگوں کو خراٹوں کی صورت سنائی دیتا تھا۔ وہ اپنی ہوا میں جھومتا ہوا دلدل پر چلا جارہا تھا جہاں کمل کے پھول اور جڑیں بکھری ہوئی تھیں۔

خدا کے پیغام آرہے ہیں، جارہے ہیں۔ لکھا گیا لفظ ہی سب کچھ تھا چاہے وہ قلب پر ہی کیوں نہ لکھا جائے یا انسانوں کے حلق، تالو اور غدود کے درمیان۔ وہ بھی لکھے ہوئے لفظ کو اپنے قلب، حلق اور تالو میں ثبت کر رہا ہے۔ اس کے سر کے اوپر کبوتر، بادل اور ہوائیں ہیں۔ کبوتر کے پنجے میں لفظ بندھا ہے۔ پانی پانی بادل میں لفظ کا عکس تھا اور ہواؤں میں لفظ کی خوشبو۔ یہ سب بھی اسی جانب جارہے ہیں جہاں وہ دلدل میں جھومتا گاتا چلا جارہا ہے۔ دلدل پر اس کے پیروں کے نشان بنتے جاتے تھے۔ یہ ایک چٹھی رساں کے اکیلے قدم تھے۔

اسی طرح گیت گاتے گاتے اس نے دیکھا کہ وہ ندی جو امر بیل کی طرح اس کے جسم سے لپٹی ہوئی تھی، وہ قطرہ قطرہ ہو کر اس سے الگ ہو رہی ہے۔ وہ اب نیچے ایک گہری گھاٹی میں بہہ رہی تھی۔ ایک کالی ندی بن کر، پتلی سی، رینگتے ہوئے سانپ کی مانند۔ وہ خوشی خوشی، نشے میں جھومتے ہوئے اس گہری گھاٹی کی طرف جانے والی ڈھلان کی جانب چلا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا، کیوں کہ وہاں ڈھلان پر، دلدل میں وہ چھوٹی سی سات سال کی بچی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بچی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بال بکھر کر ماتھے پر آگئے تھے۔ گھٹنوں سے اونچی فراک کیچڑ سے سنی ہوئی تھی۔

"روشنی۔ روشنی! میں آگیا۔ تمھارے پاپا کی چٹھی لے کر۔ سال گرہ مبارک ہو۔"

وہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ وہ خوشی سے رو رہی تھی۔

اس نے بچی کے روکھے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اپنی وردی کی اندرونی جیب سے وہ کاغذ نکال کر اس کی معصوم مٹھی میں تھما دیا۔

"میں نے تمہارے گانے کی آواز دور سے سن لی تھی۔"

"میں تمہارے لیے ہی تو گا رہا تھا۔"

"سچ؟"

"ہاں۔ آؤ اس دلدل پر گلاب اُگائیں۔"

اس نے بچی کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول دیا۔ پھر دونوں نے مل کر گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے دلدل میں گلاب بویا۔

وہاں روشنی ہوگئی۔

"اچھا روشنی۔ میں چلتا ہوں۔"

"فرشتے! تم کہاں جا رہے ہو؟"

"مجھے ابھی اپنا گیت مکمل کرنا ہے۔"

ڈھلان پر وہ آگے چلنے لگا۔ اس کے پیر یہاں دھنس رہے تھے مگر اسے محسوس ہوا جیسے وہ اڑ رہا تھا۔ زوال کا راستہ ہی روح کی اڑان تھا۔ جب وہ وادی میں نیچے بہنے والی کالی ندی میں گر رہا تھا تو ندی اُسے ایک بھیانک بارش کی طرح نظر آئی جو گھاٹی سے آسمان کی طرف بہہ رہی تھی۔ ندی ایک سرکش گھوڑی کی طرح کسی طور پر قابو میں ہی نہ آتی تھی مگر اب وہ قطعاً نہیں گھبرایا۔ پیچھے روشنی کھڑی تھی۔ اس نے اپنے وجود کو ایک عظیم الشان چھتری کی مانند کھلتا اور پھیلتا پایا جس کے اوپر سے ندی کی شور مچاتی بھیانک موجیں گزر رہی تھیں۔ اسے اپنے تمام خط، تمام محبت نامے اور پیغام بھیگنے سے بچانے تھے اور وہ کامیاب ہوگیا۔ طوفانی ہوائیں

اور خوفناک بارش اس کے چھتری جیسے وجود کو صرف پھڑ پھڑانے پر مجبور کر سکتی تھیں۔ بس!

اس نے اپنا گیت پھر شروع کیا۔

یہ گیت اس ردعمل کا نام تھا جو وہ دنیا اور فطرت کی خوبصورتی کو بھینٹ کر رہا تھا۔ اگرچہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خوب صورتی کی طرف جانے والے راستے خوب صورتی کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ یہ وہ گیت تھا جو سناٹے کی طرف نہیں جارہا تھا بلکہ سناٹے کے خلاف لڑ رہا تھا۔

وہ اب بھی دلدل پر چل رہا تھا مگر اس کے پیروں کے نشان اب دلدل سے باہر بن رہے تھے۔

تو کتنا طویل، دکھ بھرا راستہ اس نے کاٹا تھا۔ ہوا کے اندر ہوا، بارش کے اندر بارش، لاش کے اندر لاش اور خواب کے اندر خواب کو پار کرتے، گزرتے رہنا ہی اس کا عظیم مقدر تھا۔

یہ ایک اکیلے، اداس بہروپیے کے سونے اور بوجھل پیروں کے نشان تھے جو غفلت اور نیند کے خلاف ایک نیا بیانیہ گڑھ رہے تھے۔

کیا انسانیت ان نشانوں کے پیچھے چلنے کو تیار تھی؟

مگر اب اسے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس کے عقب میں دلدل پر گلزار سج رہے تھے۔ ساری سرنگوں کے دہانے روشن ہو گئے تھے......

دنیا میں پھول ہی پھول۔ روشنی ہی روشنی۔ گیت ہی گیت۔

صبح کے چار بج رہے تھے جب بارش کی۔

ڈاکٹر آیا اور اس کا معائنہ کیا۔

''بخار تو اب بہت کم ہے۔ کل سے اس علاقے میں پھر طاعون کی افواہ اڑ رہی ہے۔''

ڈاکٹر نے اس کی بغلوں اور رانوں کو ٹٹولا۔

''نہیں پلیگ تو نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مگر بخار میں بھیگ جانے کے سبب سخت اور جان لیوا نمونیا ہو گیا ہے۔''

''اور ایک بات اور...... '' ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کی پتلیوں کو کھول کر دیکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

''یہ کوما میں چلے گئے ہیں۔ شاید ایک گھنٹہ پہلے انھیں ایک ہارٹ اٹیک بھی ہو چکا ہے۔''

''کوما؟'' سب نے ڈاکٹر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں۔ ایک ایسی بے ہوشی یا نیند جس میں مر کر بھی آدمی نہیں مرتا۔ کبھی سال بھر، کبھی دو سال اور کبھی کبھی تو بیس/ سال تک بھی یا اس سے بھی زیادہ۔ کوما میں گئے ہوئے انسان کے دماغ کے خلیے کچھ اس طرح کام کرتے ہیں کہ وہ خواب ہی دیکھتا رہتا ہے۔ اور خواب بھی زیادہ تر اچھے اور خوب صورت۔ مثلاً پھولوں کے، بچوں کے، وادیوں کے اور روشنی کے۔''

اس کے بلند خراٹے اسی طرح جاری تھے۔

''یہ کیا بات ہوئی ڈاکٹر؟ یہ تو کتے کی موت مرنا ہوا۔'' اس کی بیوی نے نفرت اور شکایت بھرے انداز میں کہا۔

مع ڈاکٹر، وہ سب اس کی بیوی کی تائید میں زور زور سے سر ہلانے لگے۔

• • •

زندوں کے لیے ایک تعزیت نامہ

ہم ایک سانپ بنانا چاہتے تھے۔ یا وہ ایک نقطہ تھا جو سانپ ہو جانا
چاہتا تھا مگر راستے میں اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اپنی سمت
بدل دی۔
اب وہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ اپنے ادھورے پن میں معلق، ہوا میں
اِدھر اُدھر ڈولتا ہوا۔

(فرانسسکو کلیمینتے)

پیٹ میں کسی طوفان کی طرح لگاتار بڑھتے ہوئے تیز درد سے حواس باختہ ہوتے ہوئے،
اس نے پہلے تو سڑک کے ایک طرف دوڑ لگائی، پھر خطرناک ٹریفک کی کوئی پرواہ کیے بغیر،
سڑک کے اس پار، دوسری طرف۔ اس پار بھی بہت دور تک دوڑا۔ یہاں بھی وہی جگمگاتا
ہوا بازار، صاف ستھری دوکانیں اور خوبصورت چمچاتے ہوئے گھر۔ باقاعدہ شہری منصوبہ بندی
کے تحت بنوائے گئے تقریباً ایک جیسے گھر جیسے ایک ہی ڈیزائن کی قبریں۔ ہر قبر ایک

دوسرے کی نقل یا ہر موت ایک دوسرے کا چربہ۔

وہ مایوسی سے ایک بجلی کے کھمبے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا اور ہانپنے لگا۔

اُس نے سوچا شاہراہ سے اتر کر ان گلیوں میں نکل جانا چاہیے جو ایک دوسرے کو نوے ڈگری کے زاویے سے کاٹ رہی ہیں۔ شاید اِدھر مل جائے وہ شاہراہ سے ہٹ کر جلدی جلدی ایک گلی میں گھستا چلا گیا۔ سامنے بڑا سا پارک تھا۔ یہ گلیاں بھی اندر سے شاہراہ کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ ہر طرف بجلی کے قمقمے روشن تھے، کسی بھی کونے میں، کہیں بھی کوئی تاریکی نظر نہ آئی۔ وہ تاریکی کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کاش کوئی خالی دیوار ہی ہوتی۔ کسی مکان کی کوئی اندھیری پشت ہی ہوتی۔

وہ چوروں کی طرح مکانوں کے آگے پیچھے چکر لگانے لگا۔ مگر کسی مکان کی کوئی پیٹھ نہ تھی۔ مکانوں کے جسم پر صرف ان کے چہرے ہی چہرے تھے۔ ہر طرف غضب کی صفائی تھی۔ سارا شہر، صاف، روشن اور چمکتا ہوا جیسے ابھی ابھی لانڈری سے لایا گیا، سفید کلف لگا، کرتا پاجامہ ہو۔ اُس نے سونگھا۔ چاروں طرف سے کپڑے دھونے والے خوشبو دار صابن کی تیز مہک آ رہی تھی۔

کاش کہیں سے کوئی بدبو کا جھونکا بھی آجاتا۔ اُس نے سوچا مگر ٹھیک اُسی وقت، پارک میں لگے ہوئے پھولوں کے پودے ہوا میں لہرانے لگے۔ صابن میں پھولوں کی خوشبو بھی مل گئی۔ اب وہ اور بھی گھبرا گیا۔

سامنے والی گلی میں چلنا چاہیے۔ اُس نے سوچا اور ایک مضحکہ خیز عجلت کے ساتھ کسی پریشان حال مینڈک کی طرح اُچھلتا، کودتا وہ سامنے والی گلی میں آگیا۔ مگر یہاں بھی بالکل اسی طرح کا پارک، ویسی ہی خوشبو۔ پارک میں بیٹھے ہوئے اسی قسم کے لوگ، ہنستے بولتے اور

کانا پھوسی کرتے ہوئے۔

نالی، نالی کہاں ہے؟ اُس نے کسی نالی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر تمام نالیاں شاید پاتال میں بہہ رہی تھیں۔

جانور؟ جانور کہاں ہیں؟

مگر تمام جانور شاید گندگی کے نام پر ذبح کیے جا چکے تھے۔

سور ہی نہیں، کتے اور بلّی تک نہیں۔

افسوس کہ اُس نے ابھی تک کسی کتے کو نہیں دیکھا اور نہ ہی کہیں سے اس کے بھونکنے کی آوز آئی۔

مایوس ہو کر، وہ دھم سے زمین پر بیٹھ گیا اور اب اُسے محسوس ہوا جیسے وہ زمین پر نہیں، ایک تنی ہوئی اجلی سفید چادر پر بیٹھا تھا۔ چادر جو ہوا میں معلق تھی۔ شاید بیٹھتے وقت اسے چکر آ گیا تھا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ خلا میں پھیلا دیئے تاکہ آنے والے چکروں سے لڑ سکے۔ درد اب بڑھ رہا تھا۔ چکر اُس کے قریب آ رہے تھے۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر، چکروں کو اپنے سے دور ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اسی طرح، جھومتا، چکراتا، بائیں طرف والی پتلی گلی میں جانے لگا مگر جلد ہی یہ گلی پھر اسی بڑی، روشن سڑک سے جا کر مل گئی جہاں سے وہ اِدھر آیا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر دوڑتے ہوئے خطرناک ٹریفک کو پار کیا اور سڑک کے دوسرے کنارے پر آ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جنوب کی طرف، فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ فٹ پاتھ کے کنارے بس غبارے ہی غبارے یا پھر چاٹ کے ٹھیلے ہی ٹھیلے جہاں پکی پکائی عورتیں، فحش انداز میں اپنے لپ اسٹک لگے ہونٹ کھول کھول کر گول گپے کھا رہی تھیں۔

ایک جگہ رُک کر اس نے آسمان کی طرف، انھیں عورتیں کی نقل میں فحش انداز میں منھ کھول کر دیکھا۔ آسمان کالا اور سرخ ہو رہا تھا۔ اُس کے منھ میں دسمبر کا کہرا ابھر گیا۔ اُس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ اُسے پے در پے کئی چھینکیں آئیں اور وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ان جھٹکوں میں ایک سفاک چاقو اُس کے پیٹرو میں پیوست ہو گیا ہو، سارا جسم ہل رہا تھا۔

کہیں کوئی گڈھا، کوئی تالاب، کوئی پوکھر؟

کہیں کوئی گٹر، کوئی نالی؟

مگر نہیں اب دنیا میں ایسی چیزیں کہاں۔

کہیں کوئی کوڑا گھر؟

نہیں سارے کوڑے کے ڈھیر پھولوں کے باغات میں بدل چکے تھے۔

اس کی نظر سامنے لگے چمکتے ہوئے سائن بورڈ پر پڑی جہاں سرخ رنگ کا پھانسی کا پھندہ بنا ہوا تھا اور تحریر تھا۔

'سڑک پر سگریٹ پینے والے کا جرمانہ سزائے موت ہے۔ فضا کو کسی بھی طرح گندا کرنے والے کو شارع عام پر پھانسی دی جائے گی۔'

وہ بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ اسے سردی لگنے لگی۔ اس کی چمڑے کی پرانی جیکٹ میں بڑے بڑے سوراخ ہو گیے تھے۔ اِن سوراخوں سے سرد ہوا اور کہرا اندر پہنی ہوئی مدتوں سے میلی اُس کی نیلی قمیص میں، سینے کے پاس آ گیے۔ اس نیلی قمیص میں بھی چھید تھے۔ کہرا اس کے سینے کے بالوں کو گیلا کرنے لگا۔ اُس کے برسوں پرانے جوتوں میں ٹھنڈی ہوا آ کر بیٹھ

گئی۔ اس نے یونہی ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا ایک پل کو چاند نظر آیا مگر اس کے دیکھتے ہی، چاند اچانک کہرے کی قنات کے پیچھے چلا گیا۔

وہ فٹ پاتھ سے اتر کر کولتار کی سیاہ سڑک پر آ گیا۔

درد اسی طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے ایک خراب گھڑی کی سوئی، رُک رُک کر جھٹکے لے کر آگے بڑھتی ہے۔

رات زیادہ ہوگئی تھی۔ بازار بند ہونے لگا۔ سڑک پر چہل پہل کم ہونے لگی مگر پولیس بڑھنے لگی۔ صفائی کی حفاظت کرنے کے لیے چپے چپے پر سفید وردیاں پہنے پولیس والے موجود تھے۔ اُن کی وردیاں صابن اور پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھیں اور وہ اتنی زیادہ سفید تھیں کہ کولتار کی کالی سڑک اِن کے چمکتے ہوئے عکس سے، ناقابل یقین حد تک سفید نظر آتی تھی۔ وہ سڑک پر سگریٹ بیڑی پینے والوں یا فضا میں گندگی پھیلانے والوں کو یہیں شارع عام پر پھانسی دینے کی تیاری کر کے نکلے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں سفید چکنی رسیوں کے پھندے تھے۔ وہ اپنے آپ میں خود مکتفی جلاد بھی تھے۔ اسی لمحے اُسے محسوس ہوا جیسے اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔ وہ پاگلوں کی طرح دائیں طرف والی گلی میں بھاگا جیسے ملک الموت اُس کے تعاقب میں ہو۔

سامنے اُسے ایک گھر نظر آیا جس کی کھڑکیوں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ روشنی میں اس نے اپنی بے ہنگم اور ڈولتی ہوئی پرچھائیں کو غور سے دیکھا اور پھر جلدی جلدی کچھ نہ سوچتے ہوئے اس گھر کے دروازے پر زور زور سے دستکیں دینے لگا۔

دوازہ ابھی اندر سے بند نہ تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں کے زور سے کھل گیا۔

اس کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں، کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔

اُس نے اِن کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بس۔ پیشاب کرنے کے لیے...... یقین کریں۔ خدا کے لیے کہ بس پیشاب کرنے کے لیے۔" وہ گھگیا رہا تھا۔ کوئی میز سے اٹھا تک نہیں۔

دونوں مرد جڑواں تھے اور عورتیں بھی۔ دونوں کی دونوں کی عمروں میں بھی فرق نہ تھا۔ ایک منحوس اور نہ سمجھ میں آنے والی یکسانیت کھانے کی میز پر طاری تھی۔

وہ اپنا شوربہ پینے میں مگن تھے۔

"میں پیشاب کرنے کے لیے آپ کے گھر چلا آیا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ ایک ناشائستہ اور غلط بات ہے۔ آپ کا گھر، جناب کوئی عوامی پیشاب گھر نہیں، جہاں کوئی بھی ایرا غیرا منھ اٹھائے گھسا چلا آئے۔ مگر آپ مجھے ایک بن بلایا غریب مہمان سمجھ کر معاف کر دیں۔ مجھے بہت تکلیف ہے۔ میرا مثانہ پھٹا جا رہا ہے۔ میرے گردے میں پتھری ہے۔ براہ مہربانی مجھے باتھ روم کا راستہ دکھا دیں۔ میں زندگی بھر آپ سب کا احسان مند رہوں گا۔ آپ لوگوں کے قدم دھو دھو کر پیتا رہوں گا۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ لیا اور تکلیف کی شدت سے دوہرا ہو گیا مگر فوراً ہی اس انداز کو بدتمیزی سمجھتے ہوئے اس نے پیٹ پر سے ہٹا کر، دوبارہ اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

مرد نے اپنے ہمشکل کی طرف اور عورت نے اپنی ہم شکل کی طرف دیکھا۔ پھر وہ چاروں، سفید چھت کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں مجبور ہوں، بے حد مجبور اور شدید بیمار۔ مجھ پر رحم کیجیے۔" اس نے سردی اور تکلیف کی شدت سے کپکپاتے ہوئے منت کی۔ مگر اُس کی یہ کپکپاہٹ، سردی کھائے ہوئے، بخار میں مبتلا کسی کتے سے مشابہ تھی۔

"ہم تمہیں پولیس کے حوالے کرنے جارہے ہیں۔ بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو۔"
اُن چاروں نے ایک ساتھ کہا۔ مردانہ اور زنانہ آوازوں نے مل کر اِس جملے کو ایک پُرآسیب شور میں تبدیل کر دیا۔

"نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔" تقریباً یکساں آوازوں کے اِس آسیبی شور سے گھبرا کر اُس نے التجا کی۔

"میرا یقین کیجیے میں چور نہیں ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ شاید اس دنیا میں، میں بھی کہیں رہتا ہی ہوں گا مگر آج میں بھٹک گیا ہوں۔ اپنے گھر جانے کا راستہ بھول گیا ہوں۔ یہ شہر مجھے اجنبی لگ رہا ہے۔ شاید میں بہت دنوں تک سوتا رہا ہوں یا بے ہوش رہا ہوں یا پھر ممکن ہے کہ میری عقل اور یادداشت دونوں ہی خراب ہو گئے ہیں مگر اتنا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ یقین کریں کہ آپ کے گھر میں صرف پیشاب کرنے کے لیے ہی آیا ہوں۔ باہر سڑکوں پر، چوراہوں پر، گلیوں میں، مجھے کہیں بھی عوامی پیشاب گھر نظر نہیں آئے۔ میں نے انھیں بہت ڈھونڈا۔ شام سے اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔ گلیوں گلیوں بھٹک رہا ہوں مگر سڑک پر پیشاب کرنے کی سزا پھانسی ہے۔ وہ سب پھانسی کا سفید پھندہ لیے ہوئے شکاری کتوں کی طرح میری تلاش میں ہیں۔"

یہ کہتے کہتے، اُسی طرح اپنے دونوں ہاتھ جوڑے جوڑے، وہ اُن کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور کسی بھیگے ہوئے، مسکین اور بیمار بلّے کی مانند کانپنے لگا۔ اُن سب کے کپڑوں سے صابن اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو آرہی تھی۔ اِسی خوشبو پر، کبھی کبھی بھنے ہوئے گرم کلّے کی بو حاوی ہو جاتی تھی۔

ایک مرد نے کھانے والی سفید چمکتی ہوئی چھری اٹھائی اور کرسی سے اٹھ کر، اُس کے

قریب آگیا۔

''ذلیل چور، تجھے نہیں معلوم کہ گھروں میں ٹوائیلٹ نہیں ہوتے؟'' وہ غرایا۔

''کیا مطلب؟ اس بار درد سے نہیں، حیرت سے اُس کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔

''چلو پولیس کو فون کرو'' مرد نے دوسرے مرد سے کہا۔

دوسرے مرد نے پہلی عورت سے کہا۔

''چلو پولیس کو فون کرو۔''

پہلی عورت نے دوسری عورت سے کہا۔

چلو پولیس کو فون کرو۔''

جڑواں انسان اسے ہمیشہ سے ہی بھیانک اور پُراسرار لگتے تھے۔ اس سے اُن کی طاقت، نفرت اور تشدد میں زبردست اضافہ ہوجاتا تھا، وہ خالق کائنات کی تنوع پسندی کے خلاف نظر آتے تھے۔ اگر ایک شخص آپ کو زمین پر گرا کر ذبح کر رہا ہو تو آپ اُس کے دوسرے ساتھیوں سے کم از کم رحم کی بھیک مانگ سکتے ہیں یا آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کر سکتے ہیں۔ مگر اگر اتفاق سے وہ سب ساتھی ایک دوسرے کے ہم شکل ہوں یا جڑواں ہوں تو یہ قطعی ناممکن ہے۔

نہیں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں ان کے ہاتھوں قتل ہونا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا، میں چور نہیں۔'' وہ اسی طرح گھٹنوں کے بل، ان کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا رہا۔

اُس کے منھ سے بار بار لرزتی ہوئی آواز میں یہ الفاظ نکل رہے تھے۔

''پیشاب، بس پیشاب، میں بے قصور ہوں۔ بیمار ہوں۔''

''تم پاگل ہو، گھروں میں ایسی چیزیں بنانے سے گندگی اور بیماریاں پھیلتی ہیں۔ اب

کوئی ایسی گھناؤنی اور کریہہ حرکتیں نہیں کرتا۔ چلو نکلو۔ اپنے دماغ کے علاج کے لیے اسپتال جاؤ۔"

وہ چاروں ایک ساتھ بولے۔

مگر اِس جملے کے شور میں وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اور اُسی طرح اُن کے سامنے پڑا ابلبلاتا رہا۔

تب وہ مرد، جس کے ہاتھ میں کھانے والی چمکتی ہوئی چھری تھی، اُس کے اور قریب آیا۔

چمکتی ہوئی چھری کا سفید دستہ اُس کے سر پر پڑا۔

وہ ایک خالی ڈبّے کی طرح پیچھے، دروازے کی طرف خود بخود لڑھکتا چلا گیا۔

وہ ایک حقیر کیڑے کی طرح گھر سے باہر پھینک دیا گیا۔

دروازہ ایک تیز آواز کے ساتھ اندر سے بند کر دیا گیا۔

وہاں، زمین پر اوندھے پڑے پڑے اُس نے اپنے سر کے قریب تانبے کے ایک خالی کٹورے کو رکھا ہوا محسوس کیا اور خلا سے ٹپکتی ہوئی خون کی ایک بھیانک بوند کی مہیب "ٹپ ٹپ" کو سنا جو وقفے وقفے سے اس کٹورے میں گرتی تھی۔

بہت دیر بعد، وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر وہ بڑی مشکل سے اٹھ سکا۔ اُسے لگا جیسے پیٹ کا درد غائب ہو گیا ہے۔ اب پیشاب بھی شاید نہیں لگ رہا تھا۔ مگر سر بری طرح دکھ رہا تھا اور آنکھوں میں تارے ناچ رہے تھے۔ وہ کہرے کی چادر میں لپٹا ہوا، ڈگمگاتا ہوا بغیر کسی سمت کا تعین کیے، آگے بڑھنے لگا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا شور ختم ہو رہا تھا۔ سناٹا چھا رہا تھا مگر سردی بڑھنے لگی۔ سردی کا اپنا شور تھا۔ اس شور کو اُس کے کان نہیں بلکہ اُس کی کھال سن رہی تھی۔ جس طرح سانپ آوازیں سنتا ہے۔ اُس کے پھیپھڑے اور دل سردی کے اِس کالے بھیانک شور سے سہم کر سکڑے جاتے تھے۔

اب اُسے پھر اپنے پیٹ میں درد محسوس ہوا اور اس امر کا انکشاف بھی کہ اُس کے پیٹ میں رہنے والا درد، اُس کے دکھتے ہوئے سر کو دلاسہ دینے کے لیے کچھ لمحوں کے لیے، پیٹ اور پیٹرو سے رینگتا ہوا، اُوپر سر کی طرف آیا تھا اور اب واپس اپنے اصل ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا۔

اُسے بہت زور سے پیشاب کی حاجت ہوئی۔ اُس سے برداشت نہ ہو سکا۔ بغیر کچھ سوچے اور اپنی جان کی پرواہ کیے، وہ اپنے کانپتے ہاتھوں کی انگلیوں سے پتلون کی فلائی کے بٹن کھولنے لگا۔ وہ اب اِس سنسان سڑک پر پیشاب کر دینے کے لیے تیار تھا۔

چپے چپے پر گھومتے ہوئے، پھانسی کے پھندوں کو وہ اِسی طرح بھول گیا جیسے وہ رسّی کے نہیں، بلکہ دھول اور خاک سے بنے ہوئے پھندے تھے اور جنہیں کبھی اُس نے خواب میں دیکھا تھا۔

مگر فلائی کے بٹن کھولتے ہی اُسے یہ بھیانک احساس ہوا جیسے وہاں صرف برف کا ایک ٹکڑا تھا۔ پیشاب کی حاجت برف کی جلتی ہوئی آگ بن گئی تھی۔ ایک ٹھنڈا، برف کا گہرا زخم۔ اُس کی انگلیاں برف کے اِس جہنم میں سُن ہو کر کٹنے لگیں، کھلی ہوئی فلائی میں دسمبر کی آدھی رات کی سرد ہوائیں اور کہرے کی اڑتی ہوئی دھجیاں داخل ہونے لگیں۔

شاید لاشعوری طور پر خوف کی وجہ سے یہاں پیشاب نہ اتر رہا ہو۔ اُس نے سوچا اور اسے ایک بار پھر سڑکوں پر مارچ کرتے ہوئے، سفید وردی میں ملبوس، صابن اور پھولوں کی خوشبو سے نہائے ہوئے، ہاتھوں میں پھانسی کے پھندے اٹھائے ہوئے، جلّاد یاد آ گئے۔

اُن کا خیال آتے ہی وہ گھبرا گیا اور فلائی کے بٹن بند کرنا بھول گیا۔

بُری طرح پریشان اور سراسیمہ ہوتے ہوئے وہ جلدی جلدی بڑی سڑک کی طرف

جانے والے رستے پر چلنے لگا۔

چلتے چلتے، ایک جگہ ٹھٹک گیا۔ یہ ایک سینما ہال تھا۔ وہ خوشی اور امید سے بھر گیا۔ یہاں تو ہر حال میں پیشاب خانہ ہوگا۔ اُسے جگت ٹاکیز میں قطار سے بنے ہوئے پیشاب خانے یاد آگئے۔

ابھی رات کا شو چھوٹنے میں کچھ وقفہ تھا۔ سینما ہال کے گیٹ کیپر اندر سے بند تالے کھولنے کی تیاری کرتے نظر آئے۔

وہ جھپٹتا ہوا سینما ہال کے چوکیدار تک پہونچا۔ یہاں بھی صابن اور پھولوں کی مہک موجود تھی۔

چوکیدار نے اُسے غور سے دیکھا۔

'ایک منٹ کے لیے گیٹ کھول دو بھائی'' اُس نے التجا کی۔

''اب کیا بھاڑ جھونکنے آئے ہو، فلم ختم ہو رہی ہے۔ اگر ایک گھنٹہ پہلے آتے تو چپکے سے بالکونی میں بٹھا دیتا۔ صرف دس روپے لیتا۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔ اب تو ہیروئین اپنی جان دے بھی چکی ہے۔ فلم ختم ہوگئی۔ ''

میں فلم دیکھنے نہیں آیا۔ مجھے پیشاب کرنا ہے۔''

''کیا پاگل ہے تو''

''نہیں بھائی۔ میرے گردے میں پتھری ہے۔ میرا پیٹ پھٹا جارہا ہے۔ میں کہیں مر نہ جاؤں۔ مجھے ہال، کے اندر کسی پیشاب خانے تک پہونچا دو۔ بس پیشاب کر کے ابھی آجاؤں گا۔''
وہ اور بھی شدت کے ساتھ گڑگڑایا۔

''چل چل۔ آگے بڑھ۔ یہاں اب پیشاب خانے نہیں بنائے جاتے آگے بڑھ، ورنہ

پولیس کو بلاتا ہوں۔"

گارڈ نے اپنا ڈنڈا ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے اُسے بری طرح دھتکارا۔

اُس نے نظر اٹھائی تو سینما ہال کے اوپر ایک دیو قامت، پوسٹر ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اُسے یہ ہلتا ہوا پوسٹر پھانسی کے پھندے جیسا نظر آیا۔

وہ کسی خوف زدہ جانور کی طرح وہاں سے بھڑک کر بھاگا۔ اِس طرح بھاگنے کی وجہ سے اُس کے جسم کے نچلے حصے میں بری طرح چبھن ہونے لگی جیسے ایک نوکدار کنکری وہاں آکر پھنس گئی ہو۔ یہ بھیانک چبھن کبھی اُس کے پیٹرو تک پہونچتی اور کبھی ناف تک۔ درد اور تکلیف کی اِسی حالت میں وہ دور تک بھاگتا چلا گیا۔ پتہ نہیں یہ شہر اُس کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازوں کو سن رہا تھا یا نہیں مگر اُس نے بھاگتے بھاگتے دور کہیں ریل کی سیٹی ضرور سن لی۔

وہ رُک گیا اور اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔

ریلوے اسٹیشن چلنا چاہئے۔ وہاں تو ضرور پیشاب گھر ہوں گے۔ جانے کہاں کہاں سے مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اُس نے اپنے دل کو تسلی دی اور اُسے ایک بار پھر اپنا بچپن یاد آگیا جب ریلوے اسٹیشنوں پر موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوتا تھا۔

"بم پولس مردانہ"۔"بم پولس زنانہ"۔

ایک بار پھر، قریب ہی کہیں، ریل کی سیٹی سنائی دی اور اس نے آواز سے اندازہ لگاتے ہوئے، سڑک سے اُتر کر دائیں طرف چلنا شروع کر دیا۔

اُس کا اندازہ غلط نہیں نکلا، وہ ایک چھوٹے سے مگر جگمگاتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے سامنے کھڑا تھا۔

بھیڑ نہیں تھی۔ اِکا دکا مسافر ہی نظر آرہے تھے۔ اسٹیشن پر غضب کی صفائی تھی، عمارت سفید تھی اور گویا عطر کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اندر آیا۔ جیسے اُس کی ٹرین چھوٹ رہی ہو۔ پلیٹ فارم سنسان پڑا تھا ایک سفید پٹی کے مانند جس کے نیچے لوہے کی پٹریاں دور تک بچھی ہوئی نظر آرہی تھیں، اور لال ہرے سگنلوں کا ایک جال تھا۔

وہ پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتا چلا گیا۔ کئی جگہ اُس نے خوانچے والوں سے ٹکرا کر ٹھوکریں اور گالیاں بھی کھائیں مگر جس کی تلاش تھی، وہ نہیں نظر آیا۔

مجبور ہو کر، تھکتے ہوئے اُس نے ایک بوڑھے مسافر کی طرف دیکھا۔ بوڑھا اپنا ایک عجیب سا بیگ، جو تقریباً ایک فٹ بال کی طرح تھا اور جس پر گدھے کے کان بنے ہوئے تھے، کاندھے پر ڈالے لوہے کی پٹریوں کو خاموشی سے تکے جا رہا تھا۔

اُس نے پوچھا۔

''جناب یہاں ٹوائیلٹ کس طرف ہے؟''

''کیا'' بوڑھے کی منھ سے ایک سیٹی سی نکلی۔

''ٹوائیلٹ۔ میرا مطلب ہے پیشاب وغیرہ کرنے کے لیے۔''

بوڑھے نے اُسے اور اُس نے بوڑھے کو غور سے دیکھا۔

بوڑھے کا چہرہ ایک گہرے زخم کے نشان کی وجہ سے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے یہ ایک چہرہ نہ ہو کہ دو چہرے ہیں جو ایک ساتھ اُسے پراسرار انداز میں گھور رہے تھے۔ یہ ایک لمبا زخم تھا جو پیشانی سے لے کر ٹھوری تک جا رہا تھا۔ ایک گلابی سفید لکیر۔

''مجھے پیشاب کرنا ہے۔ میرا پیٹرو پھڑ! رہا ہے۔ میرے گردے میں پتھری ہے۔ اگر میں نے پیشاب نہیں کیا تو مر جاؤں گا۔ مہربانی کر کے مجھے بتائیں کہ میں کہاں پیشاب

کروں؟"

اُس نے طوطے کی طرح رٹے رٹائے جملے ادا کیے۔

"تم کہاں سے آئے ہو"؟ بوڑھے کی آواز واقعی ایک سیٹی کی طرح تھی۔

"جناب۔یقین کریں۔اِس وقت مجھے یاد نہیں آرہا۔درد کی شدت نے دماغ ماؤف کردیا ہے۔میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔" اُس نے لرزتی آواز میں جواب دیا۔

"کیا تم بھول گئے کہ اب اِس دنیا میں کہیں کوئی پیشاب خانہ نہیں۔"

"آپ مذاق کررہے ہیں۔میں بہت تکلیف میں مبتلا ہوں۔"

"میں تمہیں مذاق کرنے والا آدمی نظر آتا ہوں؟ مذاق میرے رتبے کی چیز نہیں۔ دیکھتے نہیں میں کتنا سنجیدہ ہوں۔میں ایک پروفیسر ہوں۔" سیٹی بہت زور سے گونجی۔

"اوہ معاف کیجیے گا۔بھلا مجھے کیا پتہ۔میں تو پیشاب......"

کیا تم اندھے ہو۔میرے چہرے پر علم و دانش کا یہ زخم نہیں دیکھتے۔ہر سچے پروفیسر کے چہرے پر یہ زخم ہوتا ہے۔"

اُس نے اپنے کانوں میں، پے در پے کئی خطرناک سیٹیوں کو سنا۔اُسی وقت ایک بے حد تیز رفتار ٹرین شور مچاتی، دل دہلاتی اور پٹریاں ہلاتی گزری۔وہ اِس اسٹیشن پر رُکی نہیں۔ٹرین کے گزر جانے کے بعد، اُسے وہاں اتنا سناٹا محسوس ہوا جیسے وہ سائیں سائیں کرتے ہوئے ایک جنگل میں کھڑا تھا۔

"دیکھو احمق آدمی۔اسٹیشن کے باہر پولیس والوں کی چوکی ہے۔اگر تم نے اُن سے اپنی اس واہیات اور مکروہ خواہش کا ذکر کیا تو تمہیں فوراً پھانسی دے دی جائے گی۔فضا آلودہ کرنے والے پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاتا بس فوراً پھانسی دے دی جاتی ہے۔"

بوڑھے کی سانسوں کے درمیان بجنے والی سیٹیوں سے ایک خوفناک خطبہ برآمد ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں، ایک پل کے لیے اُس کے پیڑو میں چبھنے والی کنکری شاید اِدھر اُدھر ہوگئی۔ درد کچھ حد تک قابلِ برداشت محسوس ہوا۔

"تو جناب کیا اِس شہر کے لوگ فطری ضروریات رفع نہیں کرتے؟ اُس نے ڈرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ اگرچہ مجھے علم ہے کہ تم یا تو پاگل ہو یا پھر کوئی جاسوس۔ مگر میں تمھارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ جب سے یونیورسٹی نے مجھے ریٹائر کیا ہے۔ لوگوں نے مجھ سے سوال کرنا بند کردیے ہیں۔ جب بہت دنوں تک کسی پروفیسر سے سوال نہیں پوچھا جاتا تو اُس کے چہرے پر لگے ہوئے علم و دانش کے زخم میں خارش ہونی شروع ہو جاتی ہے اور خارش بجائے خود ایک گندگی ہے۔"

بوڑھا رُکا اور پھر کچھ اِس طرح بولنا شروع کردیا جیسے کسی مجمع کو خطاب کر رہا ہو۔

"زمانہ ہوگیا، زمانہ ہوگیا۔ جب انسان گندگیوں کی پوٹلی اپنے ساتھ لیے لیے پھرتے تھے۔ انسان کے پاس ایک جسم کا ہونا ہی سب سے بڑا گناہ تھا۔ جسم کے سنسکار اور کرم ہی روح کو بندھن میں ڈالتے تھے۔ ساری مصیبتوں کی جڑ آدمی کا جسم ہی تھا۔ دھیان سے سنو۔ پیٹ کو کیوں بار بار پکڑ رہے ہو۔ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک دھوکہ، فریب، مایا یا سراب۔ انسان کے ساتھ جسم کی یہ علت ابتدائے آفرینش سے ہی چلی آرہی تھی اور اِسی لیے وہ جنت سے نیچے پھینکا گیا اور روح کی نجات مشکل ہوتی چلی گئی۔"

اُس نے بوڑھے کو پاگل سمجھا اور پلیٹ فارم کی سفید، بے داغ پٹی پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اِس طرح بیٹھنے میں اُس کا پیٹ اور بھی تن گیا۔ پتلون کمر پر بری طرح پھنسنے لگی۔ اُس کی سانس

سینے میں نہ سمارہی تھی۔ وہ فوراً دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بوڑھا بہت طویل القامت تھا۔ وہ تو اُس کے سامنے بونا نظر آتا تھا۔ اُس نے منھ اُوپر اٹھا کر مجبوراً بوڑھے کی بے تکی تقریر سننا شروع کردی۔ صرف اِس امید پر کہ شاید اپنی دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد، بوڑھا اُسے پیشاب کی حاجت رفع کرنے کا کوئی طریقہ بتا ہی دے۔

"سنو۔ بہت غور سے سنو" بیٹی گرجی

انسان کا جسم گندگی کی پوٹ ہے اور گندی خواہشات کا ذخیرہ ہے۔ عشق اور محبت کے نام پر جسم اپنی غلیظ ضرورتوں پر ہمیشہ پردہ ڈالتا آیا۔ مگر کیونکہ مادّے سے چھٹکارہ پانا فی الحال ممکن نہیں اس لیے شہری منصوبہ بندی والوں نے سائنس، مذہب اور فلسفے کے باہمی اشتراک کے ذریعہ، سب سے پہلے "محبت" کے کوڑے کو جھاڑو لگا کر، شہر بدر کر دیا اور اِس طرح اور اِسی قسم کی دوسری کوششوں سے، بالآخر جسم کو اُس کی آلائشوں سے یکسر پاک کر دیا۔ سارے جانور پاتال میں ڈال دیے گئے۔ یہ جدید سائنس سماج مکمل طور پر سبزی خور ہے۔ گوشت کے معنی نئی نسل، پرانی فرسودہ لغات میں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔

"آپ مہربانی کر کے، مجھے کسی اسپتال کا راستہ ہی دکھا دیں۔ میں بیمار ہوں وہاں میں اپنے پیٹ میں بھرے ہوئے اِس منحوس پیشاب سے چھٹکارہ پا سکتا ہوں۔"

اُس نے بوڑھے کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، بے چینی کے ساتھ التجا کی۔

"تم بیمار نہیں ہو۔ تمھاری روح بیمار ہے۔" اب درمیان میں بولے تو تمھارا انجام بہت برا ہوگا۔"

بوڑھے نے اُسے خوفناک نظروں سے گھورا۔ اس کے چہرے کا وہ گہرا، لمبا زخم، کسی زہریلے سانپ کی کھال کی طرح چمکنے لگا۔ رات شاید آدھی سے بھی زیادہ گزر چکی تھی۔ اچانک

پلیٹ فارم پر سرد ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ لوہے کی پٹریاں اور ہرے لال سگنل کہرے میں چھپ کر رہ گئے۔

اُس کے سر کے بال گیلے ہونے لگے۔ کھڑے کھڑے، منھ اُوپر اٹھائے، اُسے پھر چکر سا آنے لگا۔ پھٹے ہوئے جوتوں کے اندر اُس کے تھکے ہوئے پاؤں بری طرح سوج رہے تھے۔ پیشاب نہ آنے کی وجہ سے اُس کے پورے جسم پر سوجن چڑھتی جارہی تھی۔ گردوں میں ٹیس اٹھنے لگی۔

وہ درد پر قابو پانے کے لیے بار بار اپنے نچلے، خشک اور پپڑی زدہ ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیتا۔

اسپتال اب لوگ صرف اپنی روح کا علاج کروانے جاتے ہیں۔ بلغم، کھانسی، چھینک، پس اور جراثیم سے جسم نے چھٹکارا پالیا ہے۔ اسپتال پاگل خانوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔"

یک بارگی اُس کا جی چاہا کہ وہ اُس پاگل بوڑھے کا مار کر مار کر قیمہ بنا دے جو اتنی دیر سے اُسے بے وقوف بنا کر دماغ کھائے جارہا ہے مگر اس وقت اُس میں شاید ہاتھ اوپر اٹھانے کی بھی طاقت نہ تھی۔ وہ ہمت کر کے، بس یہ طنز ہی کر سکا۔

"جناب۔ کیا اب لوگ مرتے نہیں یہاں؟"

"نہیں مرتے، موت پرانی چیز ہوگئی۔ صرف جو گندا ہوگا اور گندگی پھیلائے گا، وہی مرے گا۔ موت تاریخ کے گندے کوڑے دان میں کہیں پڑی ہوگی جسے کترنے کے لیے اب اِس دنیا میں چوہے بھی نہیں۔"

اچانک پروفیسر کا لہجہ رازدارانہ ہوگیا۔ وہ اپنی آواز کو تقریباً ایک سرگوشی کی حد تک لے گیا اور پھر اچانک بلند آواز میں پھٹ پڑا۔

"اب یہ پاک و صاف شہر ایک عظیم ابدیت کے سائے میں ہے۔ جیسے ہی جسمانی مجبوریوں اور اُس کی مکروہات اور آلائشوں پر قابو پالیا گیا ویسے ہی موت دم دبا کر بھاگ گئی۔ ہاہا۔"

بوڑھے نے گلا پھاڑ ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ ایک ساتھ کئی ہزار خطرناک سیٹیاں فضا میں گونجیں اور اُس کے کاندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے پر بنے ہوئے گدھے کے کان زور زور سے ہلنے لگے۔

"تو اب بچے نہیں پیدا ہوتے؟" وہ خوف زدہ ہوتے ہوئے کراہا۔

"کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ مگر وہ اب مریں گے نہیں۔ اُن کی عمر بڑھتی جائے گی۔ وہ پرانے ہوتے جائیں گے۔ صرف پرانے اگرچہ موت اُن کو کبھی نہیں آئے گی جیسے میں ہمیشہ زندہ رہوں گا۔"

"تو بغیر گندگی کے بچے کیسے پیدا؟"

بچے اب ماؤں کے پیٹ میں نہیں بلکہ صاف ستھرے پھولوں کے باغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے عورت کے گندے جسم کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اپنے ذہن اور روح میں بچے پیدا کرنے کی خواہش کا قوی تر ہونا ضروری ہے۔ نئی دنیا مکمل طور پر مردوں کی دنیا ہے۔ ہم نے عورت کی انہدام نہانیوں کو مردہ کر کے، محض پرچھائیوں میں بدل دیا ہے۔ وہ اب گندے خون میں لتھڑے ہوئے، مہینوں کے کپڑوں سے مکتی پا چکی ہے۔ عورت ہی تو گناہ کا محرک تھی۔ مگر اب کوئی شریف اور نیک عورت محبت کا گناہ نہیں کر سکتی۔ سب کچھ پاک صاف ہو گیا۔"

"دیکھئے۔ پروفیسر صاحب، بہت ہو گیا۔ آپ نے مجھ غریب بیمار کا جی بھر کے مذاق اڑا

لیا مگر اب تو خدا کے واسطے مجھے بس اِتنا بتا دیں کہ میں پیشاب کہاں کروں۔؟"

اُسے کچھ اور نہیں سوجھا تو وہ بوڑھے کے آگے بھی اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرنے لگا۔ دونوں ہاتھ جو سردی اور تکلیف سے لگاتار کانپ رہے تھے۔

پروفیسر کے چہرے کا زخم ایک بار پھر کسی سانپ کی طرح کُلبلانے لگا۔

بوڑھا پروفیسر اپنے اس لمبے گہرے زخم کے باعث، جو اس کے چہرے کو دو برابر کے حصوں میں تقسیم کرتا تھا، تقریباً ایک شیطان یا بدروح کی طرح نظر آیا۔

"انسانوں کے جسم اب بس دیکھنے میں ہی جسم نظر آتے ہیں۔ کسے نہیں معلوم کہ ہر دیکھی ہوئی چیز سچی اور اصل نہیں ہوتی۔ جسم اب پوری طرح ذہن بن چکے ہیں۔ کیا یہ ارتقا کی عظیم ترین منزل نہیں۔ جسم اب ہر قسم کی غلاظت اور گندگی سے پاک ہے۔ وہ انسان کی روح کا ایک سچا عکس ہے۔"

شیطان نے سیٹی نما آواز نکالتے ہوئے انکشاف کیا۔

"مگر میں پیشاب۔" وہ جملہ پورا نہ کر پایا کہ پروفیسر بول اٹھا۔

"دیکھو اگر تم واقعی حکومت کے جاسوس ہو تو اب تک تمہیں یہ خوب اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں اس قومی ترقیاتی پراجیکٹ کا دل سے قائل ہوں، جس کے تحت شہری منصوبہ بندی اور محکمۂ صحت کے اشتراک کے ذریعہ ساری دنیا میں صفائی کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب سے تعلق رکھنے والے تمام دانشوران بھی اِس مہان پراجیکٹ کے حامی ہیں۔ اور اگر تم جاسوس نہیں ہو تو۔ واقعی تمہیں اسپتال جانا چاہیے جہاں اب صرف ذہنی امراض کا علاج ہوتا ہے۔ جسم کے کسی حصے میں ہوتے ہوئے درد کا نہیں۔ درد محض ایک وہم ہے۔ دماغی خفقان، روح ہر درد سے ماورا ہے۔ تم جسم نہیں۔ ایک روح ہو۔ صرف روح۔"

بوڑھا پروفیسر کسی طرح خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ پلیٹ فارم کچھ زیادہ ہی سنسان ہوگیا تھا۔ ہر طرف سے تازہ صابن اور پھولوں کی تشدد آمیز اور بے رحم مہک آنے لگی۔

ایک لمحہ کے لیے واقعی، اُس نے بھی خود کو پاگل تصور کیا۔ اُس کا جی بے تحاشے پیشاب کی کھراند سونگھنے کو چاہا۔ وہ اپنے جسم کی تمام طاقت اپنے حلق میں لاتے ہوئے بولا۔

''سور کے بچے۔ خبیث شیطان۔ میں تیرے منھ میں پیشاب کرنے والا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے، وہ ایک وحشی کی طرح بوڑھے کی طرف جھپٹا مگر پھر فوراً ہی لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے بوڑھے کے چہرے کا لمبا زخم سانپ کی طرح اُس کی طرف لپکا تھا۔

اُسی وقت فضا میں ایک سیٹی گونجی اور اُس نے صاف دیکھا کہ وہ اِدھر کو چلے آرہے تھے۔ پھانسی کے پھندے ہاتھ میں لیے۔ سفید وردی والے۔ اُس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔

مگر وہ مرنا نہیں چاہتا۔ وہ شارع عام پر پھانسی کے پھندے میں جھولنا نہیں چاہتا۔

(۲)

اس نے پلیٹ فارم سے ریلوے لائن پر اِس طرح چھلانگ لگائی جیسے ایک خوف زدہ اور رنگ بدلتا ہوا گرگٹ ایک پیڑ کے پتوں سے دوسرے پیڑ کے پتوں پر کودتا ہے۔ وہ کہرے سے لدی ہوئی ریلوے لائن پر دور تک بھاگتا چلا گیا۔ دور اندھیرے میں گرتا پڑتا، پھسلتا اور ٹھوکریں کھاتا۔

اُس کے جوتوں کے جھنگلی جیسے تلے لوہے کی سخت ٹھنڈی پٹریوں سے رگڑ کھا کر،

چھتڑے چھتڑے ہو کر ہوا میں اڑ رہے تھے۔ پٹریوں کا ٹھنڈا بے رحم لوہا اُس کے پیروں کے پنجوں اور ایڑیوں پر بھیانک ضرب لگا رہا تھا جس کی دھمک سیدھے اُس کے دل تک جا کر رکتی تھی۔

اُس کے آس پاس سے مسافر، گاڑیاں اور مال گاڑیاں گزرتی رہیں۔ وہ بھاگتا رہا اور اُس کے مثانے میں اکٹھا پیشاب اُچھل اُچھل کر اُس کے پیٹرو، پسلیوں، سینے اور یہاں تک کہ دل کو بھی ڈبونے لگا۔ ہوا بہت تیز تھی۔ اُس کی جیکٹ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ وہ کہرے کے اُٹھتے ہوئے بگولوں کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے بوندا باندی بھی شروع ہو گئی ہو یا ممکن ہے کہ یہ کہرے کے پرتوں کے بیچ پھنسی ہوئی اوس کی بوندیں ہوں۔ سردی اُس کے اُوپر کوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

کیا اُسے علم تھا کہ جلد ہی وہ ایک پیٹ پھولے ہوئے لاوارث کتّے کی طرح مرنے والا تھا؟

اُسے اب یہ معلوم تھا کہ اب کہیں کوئی ایسا زندگی بخش مقام نہیں تھا جہاں کھرا ند ہو اور انسانی سیلن ہو جس پر دیوانہ وار چیونٹیاں امڈی چلی آتی ہوں اور جہاں مردانہ کمزوری کو دور کرنے والی سستی دواؤں کے گھٹیا اشتہارات چھپاں ہوں اور جس کی دیواروں پر طوائفوں اور بری عورتوں کے فون نمبر اور پتے لکھے ہوں۔

نہیں، اب وہ کہیں نہیں ہو گا، نہ کسی ہوٹل میں، نہ کسی اسکول میں، نہ کسی عبادت گاہ کے حجرے میں، اور نہ جوئے خانے یا کسی شراب خانے میں۔

لوہے کی پٹریوں پر چڑھتا اترتا وہ اِس طرح چلا جا رہا تھا جیسے اپنی خودکشی کا تعاقب کر رہا ہو۔ حالانکہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا۔

مگر خود اُس کے تعاقب میں سیاہ کہرے کو چیرتی ہوئی بے رحم روشنیاں تھیں۔ بھورے وزنی بوٹ اور سفید، مہکتی ہوئی وردیاں تھیں اور پھانسی کے جھولتے ہوئے پھندے تھے، مگر وہ پھانسی سے نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اِس سے اچھا تھا کہ اُس کا مثانہ پھٹ جاتا یا وہ کسی ریل گاڑی کے سامنے آ کر کٹ جاتا یا کسی پہاڑ سے ہی ٹکرا جاتا۔

اور، یقیناً سامنے ایک کالا اونچا پہاڑ آرہا تھا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ اِسی پہاڑ سے آرہے تھے۔ پہاڑ جیسے سردی سے جل کر اور بھی سیاہ ہو رہا تھا اور اپنی چٹانوں کی دراڑوں میں سے کہرے کا دھواں انڈیل رہا تھا۔ اِس پہاڑ کے راستے میں سرنگیں تھیں جو کالی سے کالی رات سے بھی زیادہ کالی اور اندھیری تھیں۔ ایک اُجاڑ، بے رونق لمبی مال گاڑی سُرنگ سے ہو کر نکل رہی تھی، جیسے ایک اندھا اژدھا رینگتا ہوا جا رہا ہو۔ کالا پہاڑ، مال گاڑی کے بند اور اندھیرے ڈبوں میں گرجنے لگا۔

گرج سے اس کے کان بند ہو گئے۔ جب مال گاڑی کا آخری ڈبہ بھی سرنگ کے دہانے سے نکل گیا تو وہ بھی اِس کے پیچھے پیچھے کالی سرنگ میں داخل ہو گیا۔

یہاں اُس نے خود کو، ٹارچوں کی روشنی سے محفوظ پایا۔ مال گاڑی سُرنگ سے نکل کر کہیں دور جا چکی تھی۔ بہت دور اُس نے اُسے سیٹی دیتے ہوئے سنا مگر سُرنگ میں اُس کی گزری ہوئی دھواں آلود آواز ابھی تک پھنسی ہوئی تھی۔

وہ اندھیری سُرنگ میں ہلکے ہلکے چلتا رہا۔ اُس کا جی مالش کر رہا تھا۔ پیٹ پہلے سے بھی زیادہ پھول آیا تھا۔ چلنے میں یہ پھولا ہوا وزنی پیٹ زور زور سے ہلتا تھا۔ اُس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ شدید پیاس سے اس نے اپنے بدن کو تیزی کے ساتھ ایک بھیانک خشکی کے نرغے میں آتا ہوا محسوس کیا۔

وہ سُرنگ کی دیوار کی طرف، منھ کر کے کھڑا ہوگیا اور پتلون کی فلائی میں ہاتھ ڈال دیا جس کے بٹن پہلے ہی سے کھلے ہوئے تھے۔

مگر وہاں تو وہی برف کی جلتی ہوئی قاش۔ اُس نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ زور لگایا۔ اُس کے گردے پھٹ جانے کے قریب تھے۔ ریڑھ کی ہڈی کے گریے اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ مگر پیشاب کی ایک بوند بھی باہر نہ آئی۔

وہ سمجھ گیا کہ گردے کی پتھری نیچے آ کر، کہیں پھنس گئی ہے۔ اُسے فوری طور پر آپریشن کی ضرورت تھی۔

مگر اب اسپتال کہاں۔ صرف پاگل خانے تھے۔

اُسے یقین کامل ہوگیا کہ واقعی وہ ایک کتّے کی ذلیل موت مرجائے گا۔ سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔

سُرنگ میں دسمبر کی بھیانک اور وحشت ناک ہوائیں رقص کررہی تھیں۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اب اُسے اپنی موت کا مقام منتخب کر ہی لینا چاہیے۔

یہاں؟

نہیں یہاں نہیں۔ کالے پہاڑ کی اس سُرنگ میں تو ہرگز نہیں۔

آگے آگے، ابھی اُسے اور آگے چلتے جانا چاہیے۔ چھتڑے چھتڑے ہوتے ہوئے جوتوں کے ساتھ اِس تاریک اور پتھر کی سُرنگ میں اُس کے پیروں کی دھمک صدیوں پرانے کسی وحشی گیت سے مشابہ تھی۔ ۔

اُسے کچھ یاد کرنا چاہیے۔ یہی وقت ہے، اپنا مقدر تو کالی سُرنگ کے اِن پتھریلے آئینوں میں وہ دیکھ آیا۔ اب مایوسی کا جشن کب تک منائے۔ مگر ابھی ایک جسم اُس کے ساتھ ہے۔

وہ اِس مایوسی کا بلبلا بلبلا کر جشن مناتا ہے۔ بین کرتا ہے۔ جسم بیمار ہے، تھک کر چور ہو رہا ہے اور پتہ نہیں کب سڑنا بھی شروع ہو جائے۔

یہی وقت ہے اُسے کچھ یاد کرنا چاہیے۔ کوئی دعا۔ کوئی توبہ کہ موت آسان ہو۔ اُسے کچھ یاد کرنا چاہیے۔ یونہی چلتے چلتے۔ پھولے اور سوجے ہوئے مثانے کے درد کے اندر خود کو گم کرتے ہوئے۔ اُسے کسی پرانی یاد کے بارے میں سوچنا چاہیئے لیکن اتنا تو اُسے معلوم ہے کہ اُس کے اندر ایک برا ضمیر رہے۔ اُس کے دکھتے ہوئے سر میں یہ برا ضمیر اپنے عجیب و غریب احساسات کے ساتھ زندہ تھا۔ اِس ضمیر کا شکار کرنے کے لیے کوئی دعا نہیں تھی۔

مگر اُسے یہ ضرور یاد کر لینا چاہیئے کہ محبت کے عظیم، پاکیزہ، انسانی، اور سفید برف کے تودے جیسے سوتے سوکھ گیے۔ اور پھر اُس کی پہلی محبت بڑی آسانی کے ساتھ شکار کر لی گئی، دوسری محبتوں کے ذریعے۔

بس وہ دو بدنصیب، خلا میں تاکتی آنکھیں رہ گئیں۔ وہ آنکھیں جو محبت کرتی تھیں۔ وہ آنکھیں صبح کے مدھم ہوتے ہوئے تارے دیکھ کر بے نور ہو جاتی ہیں۔ وہ آنکھیں ان راستوں کو یاد کرتی ہیں جہاں سے ہو کر محبت گزری۔

مگر اُس کو اب کچھ بھی نہیں یاد۔ اُس کے جسم کی کھال، نہ تاریکی کا لمس محسوس کرتی ہے اور نہ روشنی کا۔ یہ کھال سن ہو گئی ہے۔ سُرنگ کے کالے پتھر جیسی ہو گئی ہے۔

سُرنگ کی دیواروں سے رگڑ کھا کھا کر وہ چلتا رہا۔ دور، ایک سرے پر، اندھیرا کچھ کم ہو رہا تھا۔ ہوا نے اپنا رخ بدل لیا۔ اب یہ بجائے مشرق کے شمال کی طرف سے آرہی تھی۔ ایک یکسر مختلف ہوا۔ سُرنگ کا دوسرا دہانہ آرہا تھا۔

آخر کار وہ سُرنگ سے باہر نکل آیا۔ اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ریلوے لائن کو پار کر کے

اپنی موت کا مقام تلاش کرنے کے لیے ایک طرف چل دیا۔

چھپاک کی آواز کے ساتھ اُس کے پیر پانی میں اترے۔ وہ رُکا نہیں، پانی میں چلتا رہا۔ پانی اُس کے جوتوں میں بھر گیا اور وہ بہت بھاری ہو گیے۔ اُس کے پیر شل ہونے لگے۔ مگر وہ چلتا رہا موت اُس کے پیروں تک آ پہونچی تھی۔ اُس کی پنڈلیوں پر اِس کالے پوکھر کی جونکیں آ کر چمٹ گئیں اور اُس کا خون پینے لگیں۔ وہ پانی سے باہر آیا۔ اُس کے جوتوں کو آبی سیوار اور کائی کے ریشوں نے جکڑ رکھا تھا۔ کچھ فاصلے پر، روشنی نظر آئی جیسے کہیں اونچائی پر بہت سی موم بتیاں جل رہی تھیں۔

کوئی بستی تھی، چھوٹی سی بستی۔

دھیرے دھیرے اُس نے گانے کی آواز سنی، کوئی گا رہا تھا۔ شاید عورتیں گا رہی تھیں۔ ڈھول بھی بج رہا تھا اور گھنگرو بھی۔ کبھی کبھی درمیان میں سارنگی کی آواز بھی بلند ہوتی۔ سارنگی کی آواز ہمیشہ انسانی آواز کی بھونڈی نقل کرتی ہے۔

مگر اِن آوازوں کے ساتھ ایک خاموشی بھی تھی، اُس نے اِس خاموشی کو اپنے کان کے بہت اندر سنا۔ اُس نے ایک گہری سانس لی تو خاموشی اور تیز ہو گئی۔ مگر شاید اُس نے سانس نہیں لی تھی۔ سانس خود اُس تک آئی تھی۔

''میں کہاں آ گیا؟'' قطار سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے قریب آتے ہوئے اُس نے خود کلامی کی۔ مگر اُس کا دل اپنی خود کلامی سے گھبرایا۔ اب اِس خاموشی میں اُس کی اپنی خاموشی کا ایماندار حصہ بھی شامل ہوا۔ رات گزرنے والی تھی۔ اِس وقت رات ہمیشہ خاموش ہوتی ہے۔ وہ انتظار کرتی ہے جب تارے مدھم پڑ جائیں۔

وہ اِن مکانوں کے ایک دم سامنے آ گیا۔ ہر مکان اداس تھا۔ ہر مکان کے اُوپر زینے

جارہے تھے۔اندھیری، تنگ سیڑھیاں، ہر مکان کی بالائی منزل پر جلتی اور ٹمٹاتی ہوئی روشنی تھی، وہاں گھنگرو تھے، ڈھول تھے، گھٹیا گیت تھے اور انسانی آواز کی نقل کرتی ہوئی سارنگی تھی۔

یہ جلاوطنوں کی بستی تھی؟

درد اور مایوسی سے بے حال ہوتے ہوئے، اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اس نے دیکھنے کی کوشش کی۔

اس کے ہاتھ پیر پتھر ہو گئے۔اُن سے سُرنگ کے پتھروں کی بو آرہی تھی۔

وہ طوائفوں کے کوٹھوں کے سامنے کھڑا تھا۔اپنے پتھر جیسے بھاری مگر موت جیسے ہلکے پیروں کے ساتھ اس نے ایک کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔

(۳)

مگر انھیں آوازوں کے ساتھ ایک خاموشی بھی ہے۔اس نے اِس خاموشی کو اپنے کان کے بہت اندر سنا۔اس نے ایک گہری سانس لی تو خاموشی اور تیز ہوگئی۔مگر شاید اس نے سانس نہیں لی ہے۔سانس خود ہی اس کے پاس آئی ہے۔

وہ کھڑکی کے پٹ کھولے، چپ چاپ، اندھیرے میں آسمان کو تاک رہی ہے۔رات اب ختم ہونے والی ہے۔اِس وقت رات ہمیشہ خاموش ہوتی ہے۔وہ انتظار کرتی ہے جب تارے مدھم پڑ جائیں۔

سیلن زدہ، افسردہ سی کوٹھری میں موم بتی کی روشنی اس کے آدھے چہرے پر پڑ رہی ہے، یہ آدھا چہرہ بے حد حسین ہے۔چمکتی ہوئی روشن اور بہت ستواں ناک، ایک بڑی سی معصوم اور تیز کٹھی آنکھ اور ایک چھوٹا سا سفید کان جو خاموشی کو سنتے رہنے کے باعث کبھی کبھی

پیلا ہونے لگتا ہے۔ آدھے چہرے پر جو آدھے ہونٹ نظر آتے ہیں وہ گہرے جامنی رنگ کے ہیں۔ یہ آدھا چہرہ بہت روشن ہے مگر صبح کے ستارے کی مانند اس کی چمک بار بار مدھم ہوتی ہے پھر بڑھ جاتی ہے۔

برابر والے کوٹھے پر سازندوں نے رات کا آخری ساز چھیڑ دیا۔ تھکے ہوئے گھنگروؤں کی تال پر اُداس بھاری کولھے ڈھول کی طرح بجنے لگے۔ پھوہڑ اور فحش گیت فضا میں بھدی بھدی آوازوں کے ساتھ، ابھرنے لگے، مگر اِن میں 'اصل فحش پن' کا عنصر غائب ہے۔ اِن ننگے گیتوں میں ایک قابلِ رحم قسم کی محرومی ہے اور مایوسی ہے۔ یہ گندے، اول جلول گیت کسی شے کے کھو جانے کا نوحہ محسوس ہوتے ہیں۔

وہ اِن گیتوں کو صدیوں سے سنتی آئی ہے مگر آج وہ اِن گیتوں کو نہیں بلکہ اپنے بہت قریب آتی ہوئی خاموشی کو سن رہی ہے۔ وہ خاموشی کی چاپ کا انتظار کر رہی ہے اور یہ یقیناً قدموں کی چاپ ہے۔ وہ مڑی اور لکڑی کے کمزور سے دروازے کو دیکھنے لگی جو اِس طرح ہل رہا ہے جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔

وہ اندر آیا ہے۔ وہ جس کی پرانی جیکٹ میں بڑے بڑے سوراخ ہیں، وہ جس کے جوتے چیتھڑے چیتھڑے ہو رہے ہیں اور وہ جس کی پتلون کی فلائی کے بٹن کھلے ہوئے ہیں، دسمبر کی سرد کالی ہواؤں اور کہرے سے اس کا چہرہ سیاہ ہو رہا ہے، اس کے سر کے بال اڑ کر پیچھے کی طرف گدی تک جا پہونچے ہیں جس کی وجہ سے اس کا ماتھا ایک چھوٹے سے سپاٹ پتھر کی طرح نظر آتا ہے جس پر نہ جانے کب کا نکلا ہوا خون جم کر کالا پڑ چکا ہے اور وہ جس کی پنڈلیوں میں زہریلی جونکیں لپٹی ہوئی ہیں۔ اور جس کے پیٹ کا نچلا حصہ ایک پھولتا ہوا غبارہ بنتا جا رہا ہے۔

وہ آتے ہی لڑکی کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں یہاں مرنے آیا ہوں، میں ایک پیشاب خانے میں مرنا چاہتا ہوں۔ میری آخری امید یہی کوٹھا ہے۔ یہاں تو وہ ضرور ہوگا۔"

"ہاں۔ صرف میرے کوٹھے پر ہے۔"

لڑکی نے اُداسی کے ساتھ کہا ہے اور موم بتی کی روشنی میں اُس کے چہرے کا دوسرا آدھا حصہ بھی سامنے آگیا ہے جو بے شمار دانوں اور پھنسیوں سے بھرا ہوا ہے جیسے کسی ڈبل روٹی کے آدھے ٹکڑے پر، لاتعداد موٹے موٹے لال لال بھتے چپکے ہوئے ہوں۔ اِن دانوں اور پھنسیوں میں اس کی آنکھ، ناک، کان اور ہونٹ محض ایک واہمہ بن کر رہ گئے ہیں۔

مگر اُس نے اِس چہرے کو نہیں دیکھا، وہ اپنے دونوں ہاتھ اُس طرح جوڑے جوڑے، لڑکی کے آدھے حسین چہرے سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہے۔

"تم پیشاب خانے میں کیوں مرنا چاہتے ہو"؟

"کیونکہ اس صاف ستھری، پاک وصاف اور شفاف دنیا میں کسی اور جگہ، ایک سڑتے ہوئے اور پھولتے ہوئے پیٹ والے کتّے کی ذلیل موت مرنے سے بہتر ہے کہ طوائف کے کوٹھے پر بنے پیشاب خانے میں دم توڑ دیا جائے۔"

"اِدھر دیکھو، اپنا چہرہ سامنے لاؤ، میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

اُس نے اپنا منھ اٹھا کر لڑکی کو غور سے دیکھا۔ لڑکی جس کا آدھا چہرہ دنیا کا سب سے خوبصورت چہرہ تھا اور آدھا چہرہ اِتنا بھیانک اور مکروہ!

وہ اُسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی آواز اُسے جانی پہچانی سی محسوس ہوئی ہے جیسے کوئی کھوئی ہوئی شے وقت کے صدیوں پرانے ٹیلوں کے عقب سے کسی کو پکارتی

ہے، مگر اُس کے دکھتے ہوئے زخمی سر میں ایک برا ضمیر ہے، برا ضمیر ہمیشہ یاد داشت کو ہی دھتکارتا ہے۔

''میں نے کتنی بار تمہیں پیار کیا۔ میں نے تمھارے اس کان پر بھی بوسہ دیا ہے جو بچپن میں بری طرح بہتا تھا۔''

لڑکی نے برسوں پرانی افسردگی کے ساتھ کہا۔

''تم کون ہو'' اُس نے کچھ خوف اور کچھ بے یقینی کے ساتھ پوچھا۔

''میں؟ میں ایک غریب ذلیل طوائف جس کے کوٹھے پر کوئی نہیں آتا۔ میں پھانسی کے پھندے سے چھپ کر اِس سیلن بھری کوٹھری میں رہتی ہوں۔ اگر کسی کو پتہ بھی چل جائے تو وہ ڈرتے ہیں کیونکہ میرے جسم کا ایک حصہ خطرناک اور گھناؤنی بیماریوں کا خزانہ ہے۔

''کیوں؟''

''کیونکہ میرے پاس ایک زندہ اندامِ نہانی ہے۔ اب شاید ہی کسی عورت کے پاس یہ ہو۔ یہ جو ناچ رہی ہیں، اِن کے پاس مردہ اندامِ نہانیاں ہیں یا محض ان کی پرچھائیاں۔ مرد یہاں ذہنی مباشرت کرنے کے لیے آتے ہیں۔ اُن کے عضوِ تناسل دیواروں پر لرزتے ہوئے تاریک سائے ہیں۔ اِن عورتوں کے گیتوں میں گوشت اور کھال کی بو نہیں وہ اپنے بھاری اور چربی کے کوبڑ نما کولہوں پر، اپنے بال بکھرا کر، زور زور سے دوہتھڑ مارتی ہیں اور وہ پھٹے ہوئے ڈھول کی طرح بجنے لگتے ہیں۔''

''تم پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہو۔ میرا پیٹ پھٹا جا رہا ہے۔ میرے جسم کا سارا خون برف بن کر جم گیا۔ میں جلد ہی مرنے والا ہوں۔''

''تم ہمیشہ سے ہی خود غرض ہو۔ ضدی اور خود غرض۔ تم نے کبھی میری بات نہیں سنی۔''

"مگر میں مرنے والا ہوں۔"

"تم نہیں مر سکتے۔"

"تم کیا جانو۔"

"میں جانتی ہوں، میں نے تم سے محبت کی ہے۔"

"میں تمہیں نہیں پہچانتا۔ مجھے پانی دو، میں ریگستان کا خشک تودہ ہوں۔"

"میں تمہارے ساتھ اُس دن سے ہوں جب تم ماں کے پیٹ میں تھے۔"

لڑکی نے مٹی کی صراحی سے تانبے کے بدرنگ پیالے میں پانی انڈیلا ہے۔ وہ پیالہ اُس کے ہونٹوں تک آپہنچا ہے۔

پانی پیتے ہی اچانک اُس کا درد جان لیوا ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے حلق سے لے کر معدے تک وہ پانی پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ اسے ایک بھیانک اُلٹی آنے کو ہوئی اور اُسے لگا جیسے اُس کی آنتیں حلق سے باہر آجائیں گی۔ دانتوں سے اپنی زبان کو بُری طرح کاٹتا ہوا وہ دوہرا ہوتا چلا گیا ہے۔ اُس نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی سفید پتلیاں باہر آنے لگیں ہیں، اُس کی ناف اوپر ابھر آئی ہے اور پیڑو اس طرح پھولنے لگا ہے جیسے کسی غبارے میں ہوا بھرتے بھرتے وہ پھٹنے والا ہو۔ اُس کا پورا جسم اکڑ گیا ہے۔ وہ پہاڑی رنگ کا کالا پتھر بن گیا ہے۔

لڑکی اب اُس کے بہت قریب آگئی ہے۔

"مجھے اپنی بانہوں میں کس کر پکڑ لو، پوری طاقت سے اپنے سینے سے لگا لو۔"

"نہیں۔ وہ دھیرے سے سسکا پھر رونے لگا۔

"میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مر جاؤں گا۔"

''تم نہیں مروگے کیونکہ تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ ڈرو نہیں میں نے اپنی ساری پاکیزگی اور محبت اپنے جسم کے ایک الگ حصے میں تمھارے لیے بچپن سے سنبھال کر رکھی ہے۔ میں تمھاری ہوں۔''

وہ اس کے اور قریب آئی ہے۔ بہت قریب۔ موم بتی کی لو بھڑکنے لگی ہے وہ ختم ہو رہی ہے۔ اُس کا موم پگھل کر اینٹوں کے بدرنگ فرش پر جمتا جا رہا ہے

وہ جیسے ہی اُس کے اِتنے قریب آئی۔ اُس نے اُسے سونگھا اور پہچان لیا۔

لڑکی نے کس کر اپنے جسم سے اُس کا جسم ملا دیا جیسے دو چٹانیں آپس میں ملتی ہیں۔ لڑکی کے ہاتھ پیر اُسے مٹی کے بنے ہوئے محسوس ہوئے۔ لڑکی نے اُس کا زخمی، ٹھوکر کھایا ہوا ماتھا اپنے ایک نرم، گول اور بڑے سے پستان پر رکھا جس میں سے جامن کے پرانے تیز سر کے کی خوشبو آرہی ہے۔ لڑکی نے اپنے آدھے جامنی ہونٹ، اُس کے خشک، پپڑی زدہ سیاہ ہونٹوں پر رکھ دیے ہیں۔

لڑکی نے اپنی آدھی، روشن، ستواں ناک سے ایک گہری سانس لی اور اُس کی بڑی سی کتھئی رنگ کی ایک آنکھ بند ہوگئی۔

لڑکی کے مٹی جیسے ہاتھ پاؤں نے اُس کے جسم کو چاروں طرف سے جکڑ لیا۔ وہ بخار میں جل رہی ہے۔

موم بتی بجھ گئی، کھڑکی میں، آسمان پر ایک سفید لکیر نمودار ہوئی۔ اچانک اُس نے محسوس کیا ہے جیسے وہ پیشاب کر رہا ہو۔ اُس کا درد کم ہونے لگا ہے۔ اُس کے سوجے ہوئے گردے اور پیڑو اپنی جگہ پر آتے جا رہے ہیں۔ پیٹ کا تناؤ ختم ہو رہا ہے، وہ ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ اِس معجزے پر اُس کا دل خوشی سے بھر آیا۔ اُسے نیند آنے لگی۔ لڑکی کے بدن کے نمک سے اُس

کی پنڈلیوں میں چمٹی ہوئی جونکیں بے جان ہو ہو کر، فرش پر گرتی جاتی تھیں۔

''مجھے نیند آرہی ہے۔'' اس نے لڑکی کے کان میں کہا۔

''سو جاؤ۔ کتنا تھک گئے ہو'' لڑکی نے محبت اور خلوص سے کہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ جو اپنی آنکھیں بند کرتا ہے، وہی اندھے پن کو محسوس کر سکتا ہے۔

''مجھے نہ جانے کب سے راتوں میں نیند نہیں آئی'' اس نے لڑکی کے خشک اور کھرکھرے بالوں کو سہلایا اور سونگھا، جن میں سے ایسی مہک آرہی ہے جو جاڑوں کی خاموش اور ملال انگیز بارش میں درختوں سے گرے ہوئے، پیلے پتوں سے آتی ہے۔

''تم میرے خوابوں میں آکر جاگتے تھے جب میں بے خبر سوتے ہوئے تمہیں پیار کرتی تھی۔''

لڑکی کے منھ سے ایک گہری سانس باہر آئی جیسے اس نے سوچھی، کرکری مٹی اگلی ہے۔

وہ بے قابو ہو کر اس سے لپٹ گیا۔

''جانتی ہو۔ انھوں نے مجھے پیشاب نہیں کرنے دیا۔ میں کتنا رویا۔''

''جانتی ہوں، اب بھول جاؤ۔'' لڑکی کی اداس اور کمزور آواز جیسے بہت دور سے آئی ہے۔

اس کے جسم میں اب کہیں درد کا نام و نشان تک نہیں بچا ہے۔ وہ ہوا کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ جیسے وہ ابھی ابھی پیدا ہوا ہے، اِسی عورت کی پسلی سے۔

اسی لمحے لڑکی کی گرفت اس کے جسم پر سے اچانک ڈھیلی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی ہے۔

فضا میں ابھرنے والے گندے گیت اور فحش ساز خاموش ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی سارنگی نے بھی آخری ہچکی لی ہے۔ صبح کی سفیدی کی شکل میں ایک سناٹا کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا ہے۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔''

وہ اس کے جسم پر سے اِس طرح پھسل گئی ہے جیسے پانی کسی کائی زدہ چکنی چٹان سے پھسلتا ہے۔

''یہ کیا ہوا تمہیں کیا ہو گیا۔'' وہ گھبرا کر، گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہوا، اس پر جھک آیا۔

''کچھ بھی نہیں، میں بس مر رہی ہوں۔''

اُس نے غور سے دیکھا۔ لڑکی کا آدھا خوبصورت چہرہ بالکل پیلا پڑ چکا ہے اور دوسرا حصہ اب نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ اُس کے پیٹ کا نچلا حصہ ایک غبارے کی طرح پھول رہا ہے جیسے اس میں لگاتار ہوا بھرتی جاتی ہے۔

''مگر کیوں، تم کیوں مر رہی ہو۔'' وہ بے تکے انداز میں رونے لگا۔

''روؤ مت، تمھارے گردوں کا سارا پیشاب اب میرے اندر ہے۔'' وہ اس سچی خوشی کے ساتھ بولی جو کسی کو صرف موت کے وقت ہی محسوس ہو سکتی ہے۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''اِس لیے کہ مجھے تم سے محبت تھی۔''

اُس کے منھ سے نکلی ہوئی آواز ایسی تھی جیسے اُس نے ایک سوکھی اور کرِی کرِی، انسانی مٹی میں ملے ہوئے خون کو تھوکا ہو۔

اُس کے آدھے ہونٹ پر ایک اجلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کی ایک کھلی آنکھ نے خود پر جھکے ہوئے چہرے کو، ہمیشہ کے لیے اپنے اندر ڈبو دیا۔

''جو محبت کرتے ہیں، انھیں مرنا پڑتا ہے''لڑکی نے اپنے ننھے سے زرد کان کے بہت

اندر سنا اور دم توڑ دیا۔

اس کی سفید شلوار پر خون کی کچھ بوندیں تیزی کے ساتھ اکٹھا ہوتی جا رہی ہیں۔

اُس کا جسم اکڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی سُرنگ کے پتھروں جیسا ہو گیا۔

وہ لڑکی کی لاش کے پاس دوزانو بیٹھ گیا ہے۔ صبح کے اُجالے کی چمک بڑھ گئی ہے اور اس چمک کے ساتھ طوائفوں کے کوٹھوں کا سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔

وہ محبت کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے اندر سے دو نئی آنکھیں نکل رہی ہیں جو اس کی پرانی آنکھوں کو آرام سے کھا رہی ہیں۔

اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کبھی نہ کبھی وہ یہاں ضرور پہنچیں گے۔ اُن کے ہاتھوں میں اس کی گردن کی ناپ کا سفید پھندا ہوگا مگر وہ یہیں بیٹھا رہے گا۔ اُن کی طرف سے پیٹھ کیے یہیں بیٹھا رہے گا۔ اِسی لاش کے پاس، محبت کے اِسی کوڑے کے پاس، طوائف کی یہ کوٹھری جو اس شہر کا اکلوتا کوڑا گھر ہوگا جو اس شہر یا دنیا کی ظالمانہ، بے حس اور غیر انسانی صفائی کے منھ پر تھوکے گا۔

وہ یہیں بیٹھا رہے گا۔ ابھی وہ مرے گا نہیں۔ ابھی اُسے محبت کرنا نہیں آئی۔ جس دن وہ محبت کرنا سیکھ جائے گا وہ بھی مر جائے گا۔ اِسی خوبصورت کوڑا گھر میں دفن ہو جائے گا ورنہ ایک منحوس ابدیت اُس پر مسلط رہے گی۔ ابدیت نہ تو محبت کو پسند ہے اور نہ موت کو۔

اُسے ابدیت کے کالے، فحش خنجر سے اپنی پیٹھ کو بچائے رکھنا ہے۔

ختم شد

• • •

خالد جاوید کی نثر کیکڑے کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ دائیں بائیں اور آگے پیچھے سب کچھ سمیٹتے ہوئے۔ اُن کی نثر ہر قسم کی ناپسندیدہ بات کا بوجھ اُٹھانے پر بھی قادر ہے۔ اس نثر کا آہنگ بہت سست رفتار ہے۔ جہاں درد کی شدت یا جوش اور جذبے کی طوفانی کیفیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے وہاں آہنگ پھر بھی سست رو ہوتا ہے۔ لیکن نثر کا زور بڑھ جاتا ہے اور وہ تمام باتیں جو خالد جاوید کے افسانے کو یادگار بناتی ہیں، اور بھی زیادہ بروئے کار آنے لگتی ہیں۔ خالد جاوید کا افسانہ الفاظ کو محسوس کرکے اور سن کرکے، انہیں جسم کی سطح پر موجود قرار دینے کا طریقہ ہمیں سکھاتا ہے۔ یہاں الفاظ کو جامد "شے" نہیں بلکہ سیّال لہروں کا درجہ حاصل ہے۔ یہ سب چیزیں اُن کے افسانے کو عام بیانیہ کی سطح سے اُٹھا کر کسی طرح کے روحانی منشور کا درجہ عطا کرتی ہیں۔

شمس الرحمان فاروقی

خالد جاوید کی کہانیاں بہت اکیلی اور بے میل اور ہر طرح کی باہری امداد اور سہارے
سے محروم ہیں۔ ان کو سہارا ملتا ہے اپنی گھنی سرکش زبان اور ہر طرح کی بندشوں
کو خاطر میں نہ لانے والے بیان سے۔ گہرے وجودی سوالات اور فکری بحثوں کے پہلو
خالد جاوید کے یہاں اس خاموشی کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں، جیسے ٹہنیوں پر
انکھوے اور کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ یہ کہانیاں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، نیّر
مسعود کی کہانیوں سے تو الگ ہیں ہی، ہم عصر لکھنے والوں سے بھی کوئی مطابقت
نہیں رکھتیں۔

شمیم حنفی

ہیئت کا نستعلیق حسن خالد جاوید کے ہر افسانے کا وصف ہے۔ زبان و بیان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ گھر، گلی، کونے کھدرے اور دل و دماغ کے تاریک گوشوں میں بھی افسانہ نگار کی نگاہِ تخیل پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے زبان بھی اپنی زنبیل لے کر باریک سے باریک جزیات اور لطیف سے لطیف احساس کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے لیے حاضر ہو جاتی ہے۔ افسانے کا ایسا حسن تعمیر میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔

وارث علوی

بیانیہ کے تسلسل کو بڑی بے دردی سے صدمہ پہنچانا، بڑے غیر محسوس طور پر سچویشن کو ایک مہین سے وقفے کے بعد دوسرا تناظر مہیا کر دینا، تمام سروں کو ڈھیلا چھوڑ دینا، حتیٰ کہ انہیں بار بار اِتنا اُلجھا دینا کہ قاری کے لیے وہ ایک آزمائش ہی نہیں، ایک چیلنج بھی بن جائیں۔ خالد جاوید کے لیے یہ سارا عمل ایک کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ خالد جاوید کے فکشن پر گفتگو کے لیے افسانوی تنقید کے رسمی اور کتابی آلات نقد تقریباً ناکافی ہیں۔ ایک طرف خالد جاوید کی غیر رسمی کہانیوں/ناولوں کی انتشار آگیں فضا و تنظیم ایک مسئلہ ہے جس کے جوڑ ہر جگہ سے اُدھڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسرے تنقید کے دستیاب آلاتِ نقد کی نااہلی جو اُس کے فکشن کی جسامت پر چست نہیں بیٹھتے۔ بار بار فلسفیانہ استبعاد سے مڈبھیڑ اور زبان کی اندرونی قوتوں کو مسلسل بروئے کار لانے کا عمل ہمیں اُس سے جوجھنے اور دو دو ہاتھ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اتنے بہت سے مراحل سے گزرنے کی جس میں تاب و توانائی ہو اُسے ہی اس سرکش دیو کو بوتل میں اُتارنے و جسارت کا مظاہرہ کرنا چاہیے ورنہ گفتگو سے خاموشی ہزار درجہ بہتر عمل ہے۔

عتیق اللہ

اِس وقت اُردو فکشن میں کوئی خالد جاوید کا حریف نہیں۔ مابعد جدید عہد کی جیسی گھری بصیرت، اُس کے تضادات کا جیسا علم، اُس کی حقیقت کے تشکیلی ھونے کا جیسا ادراک اور اُسے فکشن کی زبان میں پیش کرنے کا جیسا ھنر خالد جاوید کو ھے، اُردو کے فی الوقت کسی فکشن نگار کو نھیں، اُس پر مستزاد اُن کے فکشن کی روح رواں وجودی بصیرت جس میں تاریکی مَوت اور اُن کے سلسلے میں جدّوجھد خالد جاوید کے فکشن کی خاص پھچان ھے۔ زبان اور حقیقت کے نازک پیچیدہ اور سخت متضاد تعلق کا احساس بھی اُن کی تحریروں کی انفرادیت ھے۔

ناصر عبّاس نیّر

ایک قلم ھے جو سمت اور ھدف کے تعین کے بغیر یا شاید بے حد تعین کے ساتھ، ایک کھلے خنجر کی صورت میدانوں بیابانوں اور دریائو ںکو کاری ضرب لگاتا آگے ھی آگے رواں دواں ھے، لا محدود اور بیکراں زمانوں میں گم ھونے کے لیے۔ غیظ و غضب کا ایک سمندر ھے جس کی لھریں پھاڑوں سے زیادہ بلند اور روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز رو ھیں۔ ایک متن ھے جو سنگ کی طرح ٹھوس ھے اور ایک زبان ھے جو شراب کی طرح سیّال ھے۔ ایک پلاٹ ھے جس کی کھانی اَنت سے شروع ھوتی ھے اور پھر ختم ھی نھیں ھوتی، جاری ھی رھتی ھے۔ کردار پرشور پانیوں میں ڈوب جاتے ھیں اور ھر جگہ نامراد دُکھوں کے جزیرے اُبھر آتے ھیں۔ خالد جاوید کی تحریر پڑھ پانا مشکل اور اسے بھول پانا مشکل کام ھے۔

سیّد محمد اشرف

خالد جاوید کی کہانی صرف اور صرف اذیّت ہے۔ وجود کی ناقابل بیان اذیت۔ مَوت خالد جاوید کی کہانیوں میں مسلسل زندگی کا تعاقب کر رہی ہے۔ کبھی ایک آگے آجاتا ہے، کبھی دوسرا کھلاڑی۔ زندگی اور اُس کے بعد مَوت اور اس کے بعد پھر زندگی اور اس کے بعد کہانی جو زندگی سے بھی آگے ہے اور مَوت سے بھی ماورا۔ اس کی کہانی کا ماجرا اتنا مکمل ہے کہ فارم، تکنیک یا صنف کے تعین کے سوالات غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔ ان کے یہاں کرافٹ کا شعور اتنا گہرا ہے کہ کرافٹ سادگی کے ساتھ موجود ہوتے ہوئے بھی غائب معلوم ہوتی ہے۔ یہ وژن خالد جاوید کی نادرہ کاری کا جوہر ہے اور یہ جوہر انہیں معاصر اُردو افسانے میں ایک بالکل ہی منفرد انداز کا حامل بنا دیتا ہے۔ جس کے موجد بھی وہ نظر آتے ہیں اور خاتم بھی۔

آصف فرخی

فلسفہ جمالیات، نفسیات اور ادبی تنقید
مارکسزم اور ادبی تنقید
ستیہ جیت رے کی کہانیاں (انتخاب اور ترجمہ)
ہندسوراج (ترجمہ)

ناولوں اور کہانیوں کے ترجمے انگریزی اور ہندی کے علاوہ ملک کی دیگر علاقائی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ کئی کہانیاں، ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے ساتھ ساتھ امریکہ کی بھی چند یونیورسٹیوں کے کورس میں شامل ہیں۔ ہندوستان کی کچھ درس گاہوں میں ناولوں اور کہانیوں پر ایم۔فل کے مقالے لکھے گئے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ انگریزی میں اُن کی تخلیقات پر پی ایچ۔ڈی۔کی تھیسس بھی لکھی جارہی ہے۔
ملک کے کئی اردو اور ہندی ادبی اکیڈمیوں نے اُن کی فنّی اور تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اُنھیں اپنے ایوارڈوں سے نوازا ہے۔ خالد جاوید کو کتھا ایوارڈ کے ساتھ ساتھ ہندی کے باوقار 'پاکھی سمّان' سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔

خالد جاوید کا بیانیہ سیّال ہے، ٹھوس نہیں مگر تجریدی بھی نہیں۔ ٹھوس اشیا بہت آسانی سے اپنی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اُنھیں گرفت میں لینا آسان ہوتا ہے۔ ٹھوس چیزوں کا ایک مقام یا مکان (Space) ضرور ہوتا ہے اور اسی لیے وہ وقت کی اہمیت کو قدرے کم کر دیتی ہیں کیونکہ وہ بہاؤ کو یا حرکت کو روکنے کی لگاتار کوشش میں لگی رہتی ہیں مگر سیّال چیزیں اپنی کوئی پائیدار شکل نہیں رکھتیں وہ اُسے لگاتار بدلتی رہتی ہیں، اس لیے یہاں مکان نہیں بلکہ زمان یا وقت کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سیّال اشیاء کو آسانی کے ساتھ روکا نہیں جاسکتا۔ وہ تو چلتی رہتی ہیں، سفر طے کرتی رہتی ہیں۔ رِستی رہتی ہیں، اُبلتی رہتی ہیں۔ خالد جاوید کے لفظ، جملے اور بیانیہ سیّال ہیں۔ زندگی بھی ٹھوس نہیں بلکہ سیّال ہے۔ اسی طرح خالد جاوید کا بیانیہ زندگی کے اصل جوہر سے مماثل ہے۔ وہ ایک ہی کہانی میں لگاتار مختلف اشکال اختیار کرتا جاتا ہے۔ عقل اور پاگل پن، سنجیدہ اور کامک، اصل اور نقل، دُکھ اور قہقہہ اور ایسے ہی دوسرے متضاد عناصر اتنی سرعت اور تیزی کے ساتھ اُن کے بیانیہ میں آتے جاتے رہتے ہیں کہ بیانیہ کو اُس کی اصل ماہیت میں گرفت میں لے پانا اُتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے جتنا کہ وقت کو گرفت میں لے پانا۔ اگر کوئی عنصر اتنے غیر متوقع طور پر اپنا سراغ چھوڑتا ہے تو وہ صرف 'وقت' کے بہتے جانے کا ملال انگیز احساس ہے اور یہ احساس 'مَوت' کے احساس سے ملتا جلتا ہے۔

Teen Kahaniyan (Urdu Fiction)
by Khalid Jawed

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com
A for Arshia Publications
ISBN 93-89455-27-8

+91 9971-77-5969
www.arshiapublications.com
arshiapublicationspvt@gmail.com